

آر شہ

کومل ذہنتان

پاک سوسائٹس ڈاٹ کام

آرشی دوم

کوئل ذیشان

پاک سوسائٹی کے تحت شائع ہونے والے ناول "آرشی" کے حقوق طبع و نقل بحق ویب سائٹ **Paksociety.com** محفوظ ہیں۔

کسی بھی مندر، ادارے، ڈائجسٹ، ویب سائٹ، پبلیکیشن اور انٹرنیٹ کسی کے لئے بھی اس کے کسی حصے کی اشاعت، **سکرین شارٹ لیکر فیس بک پر لگانے** یا کسی بھی ٹیوی چینل پر ڈرامہ و ڈرامائی تشکیل و ناول کی قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر (پاک سوسائٹی) سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ ب صورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی اور بھاری جرمانہ عائد کرنے کا حق رکھتا ہے۔

نوٹ: آرٹھ پاک سوسائٹی کے لیے لکھی گئی خصوصی تحریر ہے۔

دوسرا حصہ

”زندگی کار از جو جان لے وہ شاید خود کشی کر لے۔“ اس نے مڑ کر آرٹھ کو نہیں دیکھا تھا کیونکہ وہ سچ کہہ رہا تھا۔

”زندگی آس ہے، بھر ہے اور موت کا نام آس ختم ہونا ہے۔۔۔ قدرت کے قانون بہت ظالم ہیں یہ کسی کو بھی نہیں بخشے۔۔۔ اگر زندہ رہنا ہے تو انہیں قوانین کے تحت ورنہ مر جاؤ کوئی تمہیں بچانے کے لیے نہیں آئے گا۔ وقت کا یہ دریا تمہیں خود تیر کر پار کرنا ہے کوئی تمہارے لیے تیر نہیں سکتا جیسے کوئی تمہارے لیے کھا نہیں سکتا، سانس نہیں لے سکتا خود کو زندہ رکھنے کے لیے تمہیں خود کھانا ہے۔۔۔ خود سانس لینا ہے۔“

یہ باتیں آرٹھ نے اس سے کسی ان دیکھی دنیا میں اپسراؤں کے رجسٹر میں حاضری لگوانے کے بعد کہی تھیں اور جب وہ کہہ رہا تھا اس وقت اس کے ارد گرد ہر شے شور کے باعث ارتعاش میں آگئی تھی۔ یہ شور ہوائی جہاز کا تھا۔ آواز دھیرے دھیرے قریب ہوتی گئی اس نے بمشکل اپنے اڑتے بال سنبھالتے ہوئے آرٹھ کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑا۔ یہ دنیا کی پہلی عورت تھی جو محو پرواز تھی۔ اس نے منظر سے غائب ہو جانے تک اسے دیکھا تھا۔

”آرٹھ میرا سوال کچھ اور تھاتم مجھے کچھ اور دکھارہے ہو۔“ اگرچہ اسے شدید تجسس اور دلچسپی ان سب چیزوں میں محسوس ہو رہی تھی مگر اس کا سوال، اس کی خواہش کچھ اور تھی۔
 ”فکر نہ کرو بچے تمہاری یہ تکلون حل کر کے دوں گا۔“ آرٹھ نے ہاتھ میں پکڑے کاغذ کو دیکھتے ہوئے اس کے سر پر چپٹ لگائی تھی۔

”کیا یہیں میرے سوالوں کے جواب موجود ہیں؟“ وہ حیران ہوئی تھی۔
 ”بالکل۔“ اور وہ اسے لیکر ایک خواب میں داخل ہو گیا تھا۔

یہ کویت کا سنہرا صحرا تھا جہاں سمندر کنارے کچھ لوگ کشتیاں بنا رہے تھے۔ کویتوں کی ثقافت جس پر وہ فخر کرتے تھے یہ فن خاندانی وراثت کے طور پر منتقل ہوتا تھا۔ دو آدمی سفید پکڑیوں میں، لمبے لمبے داشے پہنے بھجور کے تنوں سے کشتی بنانے میں مصروف تھے۔ کچھ دائیں طرف کشتیوں کے لیے درکار رسیاں بنا رہے تھے۔ ریشوں سے سوت اور سوت سے ڈوری، چھ سوت کو ملا کر ایک ڈوری بنی اور تین یا چار ڈوریوں سے ایک رسی وجود میں آتی تھی۔ وہی پیٹرن جو زندگی پر حاوی ہے۔۔۔ وہ دلچسپی سے انہیں دیکھنے لگی۔

”تم دیکھو ہر چیز کا ایک مرکزی خیال ہے ایک نقطہ ہے جہاں پر اس کا جوہر ہے، اس کے وجود کا مقصد پنہاں ہے جیسے رسی کا ”باندھنا“ کشتی کا ”تیرنا“ ایک لفظ میں ان کو ڈیفائن کیا جاسکتا ہے اس طرح انسان کا بھی ایک جوہر ہے۔ ہر انسان کا مرکز مختلف ہے دوسرے سے، ہر انسان کی تعریف مختلف ہے۔“ ہنہ سارا نے سر ہلایا۔

ایک طرف لکڑیوں کے خوشنما پھٹے رکھے تھے۔ کچھ ہلکے بھورے بسکٹ جیسے رنگ کے جس سے کشتی کا پینڈا بنایا جاتا تھا، واکا تھوڑے گہرے بھورے رنگ کی لکڑی تھی ایک خاص پیٹرن کے ساتھ کشتی کے تختوں کے لیے اس کا استعمال کیا جا رہا تھا، پالی گہرے اور ہلکے بھورے رنگوں کے امتزاج کے ساتھ

اوپر والے تختوں کے لیے اور طولی ساخت کے لیے تھی، بینڈٹیک پانی کے نیچے کے حصے کے لیے اور شہتیر کے لیے پوون۔

”یہ تمام لکڑی بھارت سے درآمد کی جاتی ہے۔“ آرٹھ نے اس کی محویت توڑی۔
 ”کھلے عام دعوت ہے۔۔۔ نگاہوں سے چھوؤ، ہاتھوں سے محسوس کرو، خوشبو کو دل میں اتارو کہ یہ تمہارے دیس سے آئی ہے۔“

”تم مجھے زندگی سے ملانے ماضی میں کیوں لے کر آئے جو گزر چکا ہے۔۔۔ جو قدیم ہے۔۔۔ مستقبل میں کیوں نہیں لیکر گئے؟“ سارا نے اس سے پوچھا۔

”کیا تم جانتی نہیں مستقبل ماضی ایک جتنے قدیم ہیں سارا۔“ وہ کچھ بولی نہیں سوچتی رہی۔
 وہاں بننے والی ہر کشتی کا الگ سے نام تھا، السنپوک، الشوعی، جالبوت۔ بغلہ، غنچہ (کشتیوں کے نام) پر نقاشی کی جا رہی تھی جبکہ روایتی درمیانے سائز کی کشتی سادہ تھی۔ وہ کشتی بان کے مہارت سے چلتے ہاتھوں میں آنے والے مختلف اوزاروں کو کافی دیر دلچسپی سے دیکھتی رہی تھی۔

پھر وہ دونوں کچھ دیر سستانے کے لیے ساحل پر آ بیٹھے تھے۔ لہروں کی مدھم آواز جیسے فرشتے کسی صحیفے کی تلاوت میں مصروف تھے۔ ہر کچھ فاصلے کے بعد کھجور کے اکاؤ کا نظر آتے درختوں کے پتے ہوا سے سرسرا رہے تھے۔

”سمندر محبت ہے آرٹھ۔“ وہ دھیرے سے مسکرایا۔

”ہاں سمندر زندگی ہے۔“

”ایک ہی بات ہوئی نا۔“

”اس قدیم دنیا میں لوگوں کا سفر صرف سفر نہیں تھا محبت تھا۔۔۔ وہ لوگ آسمان پر چمکتے تاروں سے راستہ پوچھا کرتے تھے۔۔۔ ان کے ہاتھوں میں جادو تھا وہ ہند سے خوشبودار مصالحے لا کر سونے میں

بدل لیتے۔۔۔ وہ صرف خریدتے اور بیچتے نہیں تھے اندر اور باہر کی دنیا میں دریافت کرتے تھے، سیکھتے تھے۔۔۔ اس دھرتی پر پیدا ہونے والی پہلی کشتی جانتی ہو کونسی ہے؟“ اس نے اس بے وقت کی جذباتیت سے باہر آتے ہوئے کہا۔

ظاہر ہے سارا کو کہاں معلوم تھا۔

”ڈھو۔“ اس نے اپنی جذباتیت پر قابو پاتے ہوئے کہا اور ریت میں غائب ہوتے کیڑے کو دبوچ لیا۔

”اب تم یہ حرکت میرے سامنے مت کرنا کم از کم۔“ وہ پو پلے منہ سے مسکرایا۔
 ”اوکے نہیں کرتا ایسا کرو تم چہل قدمی کر آؤ پھر میں تمہیں کشتی کی کہانی سناؤں گا۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”اور کشتی کی کہانی میں زندگی کیا ہے کے جواب کا کیا جواز۔“ اس نے لپجائی نظروں سے کیڑے کو دیکھتے ہوئے منہ بنایا۔

”اگر صبر سے کام نہ لیا جائے تو خضر اور موسیٰ کو بچھڑنا پڑ جاتا ہے لڑکی۔“ وہ شرمندہ سا مسکرائی اور چار پانچ سو سال پرانی ریتوں میں دھیرے دھیرے قدم بڑھانے لگی۔



”۲۳۰۰ سال قبل مسیح وہ اول اول کشتیاں جو قدیم مصر میں نیل کے پانیوں میں ہلکورے لیتی تھیں وہ سرکنڈوں اور بانس سے بنائی گئی تھیں۔“ وہ دونوں ساحل پر بیٹھے اب شفق کی روشنیوں میں رنگین ہوتا سمندر دیکھ رہے تھے۔ سارا ہمہ تن گوش اسے سن رہی تھی۔

”مصر میں ۲۵۰۰ سال قبل مسیح سمندر میں سفر کرنے والی پہلی کشتیاں بنائی گئیں جو کہ لکڑی سے تعمیر کی گئی تھیں پھر ۷۰۰ سال قبل مسیح فونییشینز نے چوؤں کی مدد سے چلنے والے بحری جہاز بنائے اور

بحر روم میں دو ہزار سال تک فتح یاب رہے۔ آٹھویں صدی میں عربی ملاحوں نے بحر ہند میں نئے راستے دریافت کیے اور سمندری ریشمی راستے

I mean silk rout کو تجارت کے غرض سے چین سے یورپ تک پھیلا یا۔ نویں صدی میں پولینیشیائی (Polynesians) باشندوں نے بحر کاہل کے جزیروں کو چوبی کشتیوں کے ذریعے پہنچ کر آباد کیا۔ ۱۰۰۰ قبل مسیح میں وائکنگز (Vikings) کم گہرے پانی میں چلنے والی کشتیوں سے دریاؤں اور سمندر میں بھی سفر کرتے رہے۔ گیارہویں صدی میں چین کی قدیم کشتیوں میں پتواریں اور گھنٹے سمندر میں بہنے کی مضبوطی پیدا کی گئی اور کشتیوں میں ایسے کمرے بنائے گئے جن میں پانی نہیں داخل ہو سکتا تھا۔ پندرہویں صدی میں بہت سی قوموں نے جنگوں میں، علاقوں کی دریافت کے لیے اور تجارت کے لیے کئی شہتیروں والے بحری جہاز استعمال کرنا شروع کیے۔ عرب کے ماہر جہازرانوں کا علم عربی اور لاطینی نقشوں میں متعارف ہونے لگا جس سے افریقہ اور نئی دنیا کی طرف سفر میں تیزی آئی۔

۱۵۱۹ سے ۱۵۲۲ تک پہلا میگیلن وکٹورین بحری جہاز (Magellan Ship Victoria) نے ساری دنیا کا چکر لگایا۔ “وہ بولتا جا رہا تھا اور سامنے کچھ فاصلے پر ہوا کے پردے پر سارا کے سامنے تصویریں ابھر اور مٹ رہی تھیں۔

”پیروسکاف (Phyroscaphe) ۱۷۸۳ میں پہلی بھاپ سے چلنے والی کشتی تھی۔“ ایک خوبصورت کشتی نمودار ہوئی سفید دھواں چھوڑتے۔

”۱۸۰۰ میں پہلی زیر سمندر چلنے والی نوٹیلوس (Nautilus) بنائی گئی۔“

اب اسے ایک آبدوز چلتی نظر آئی۔ ۱۸۱۹ میں پہلا بحر اوقیانوس کو پار کرنے والا بھاپ سے چلنے والا جہاز السیفینہ بنایا گیا اور ۱۸۳۹ میں بحری جہاز ارشمیدس جو کہ مشین پکھے سے چلتا تھا۔ “اسے یقین نہیں آ رہا تھا وہ یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہے۔

”۱۸۲۲ میں آرون پہلا بحری سفر کرنے والا جہاز، ۱۸۴۰ سے ۱۸۶۰ لمبی پتلی جسامت والے بحری جہاز بنائے گئے، لمبی شہتیروں والے انہوں نے تیز رفتاری کے سارے ریکارڈ توڑ ڈالے۔ پھر ۱۸۴۵ میں لوہے سے بنے بحری جہاز اور مشینی پنکھوں سے چلنے والے بنائے گئے۔ ۱۸۸۶ میں پہلی موٹر بوٹ بنی۔ ۱۹۰۳ میں پہلا ڈیزل سے چلنے والا بحری جہاز بنایا گیا تب کوئلے کی مدد سے چلنے والے سٹیم شپس میں تیل استعمال کیا جانے لگا۔

۱۹۱۲ میں جب ٹائٹنک ڈوبا اور بے تحاشہ جانیں ضائع ہوئیں تو نئی حفاظتی تدابیر پر غور کیا جانے لگا۔“

سکرین پر اس نے ٹائٹنک کو ڈوبتے دیکھا اسے مووی کا سین یاد آنے لگا۔ وہ کافی کم عمر تھی جب مووی آئی تھی اس کے کزن نے ان تمام بچوں کے لیے خاص مووی کو کاٹ پیٹ کر اردو میں ڈب کروا کر سب بچوں اکٹھا بٹھا کر دکھائی تھی۔ پھر اسے اپنی ایک دوست کی اس مووی پر حال ہی میں لکھی نظم یاد آئی۔

روژا علی خانوادہ، بے نظیر

اسکا چہرہ جیسے کھل اٹھے گلاب

روژاک مصنوعی دنیا کی اسیر

زرد پڑنے کو ہو جیسے آفتاب

اور پھر ملنا وہ اک لڑکا اسے

جس کو اپنا غم نہ دنیا کا خیال

جس کا دل سونے کے سکے کی طرح

بن گیا جواک محبت کی مثال

ایک وہ الماس والا آدمی
جس کی دولت کے تماشے جا بجا
آخر آخر ایک ہیرے کے عوض
جس نے کیا چالیں چلیں کیا کیا کیا

اور پھر چٹان سے اک برف کی
اک تصادم کا بدلنا زندگی
مسکرا کر رقص کرتی گھومتی
ہاتھ اپنے جھاڑ چلنا زندگی

آہ وہ موسیقیت کی طرز پر
کیپٹن کالوٹنا تنہائی میں
موت کی آہٹ پہ راضی لوگ وہ
جو تھے شامل انجمن آرائی میں

ناگہاں آفت یہ کیسا حادثہ
جاں بچانا جس پہ مشکل ہو گیا

جس نے برتا عمر بھر تہذیب کو
وہ بھی کچھ لوگوں کا قاتل ہو گیا

تیز رو پانی پھر تا دوڑتا
رفتہ رفتہ ڈوبتا جاتا جہاز
غرق کرتا ایک اک کر کے سبھی
ٹائٹنک کا سفر اور اسکے راز

یہ محض اک فلم ہے یا نسبتاً
وقت اور احساس کا اک رنگ ہے
یہ محض اک فلم ہے یا روبرو
زندگی اور موت کی اک جنگ ہے

”۱۹۵۹ میں پہلا نیوکلیر پاور شپ تعمیر ہوا اور اسی وقت فائبر گلاس سے تعمیر شدہ کشتی وجود میں آئی۔“ وہ آرٹھ کی آواز سے چونکی اور پھر ہوا کے پردے پر بنتی تصویر دیکھنے لگی۔
”۱۹۱۹ میں ہائیڈرو فوئل جہاز وجود میں آئے جو پانی کی رفتار کا حساب رکھ سکتے تھے۔ ۱۹۷۹ میں دنیا کا لمبا ترین جہاز بنایا گیا۔“ آرٹھ نے ریت میں پڑا تنکا اٹھا کر اپنا نام لکھتے ہوئے معلومات کی آبشار جاری رکھی۔

”۱۹۵۵ میں کنٹینر شپ بنایا گیا جو کہ تجارت کی دنیا میں دھماکہ تھا۔“ پھر سکرین پر ایک کشتی کی

تصویر ابھری جس نے ۱۹۸۴ میں ریس جیتی تھی۔ ”اس کا نام وائٹ ایوکیو آف شار پاور بوٹ (White Iveco Offshore Powerboat) تھا۔“

”چلو اٹھو اب مجھے تمہیں مواصلات کی جادوئی دنیا کی ایک اور شاہکار ایجاد کی تاریخ دکھانی ہے۔“ وہ یکدم کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ بھی بغیر سوال کیے اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”آرٹھ تم میرے بیسٹ فرینڈ ہو۔“

”اور تم میری۔“ وقت کی ایک اور ڈائمنشن میں آرٹھ کی آواز گونجی تھی۔

سکاٹ لینڈ کے سرسبز علاقے سے تعلق رکھتا وہ لڑکا رابرٹ ڈبلیو تھامس اس کے سامنے پہلا ہوائی ٹائر بنانے میں کامیاب ہوا تھا۔ اس نے اس کے چہرے پہ پھیلی خوشی اپنے اندر اترتے محسوس کی تھی۔ آرٹھ نے ایک ہاتھ ہوا پر پھیرا وہاں لکڑی پر چمڑا چڑھے پہیوں والی سواریاں تھیں اور پھر اس نے اسے وہ انقلاب دکھایا جو ہوائی ٹائر سے جو کہ ربر کی مدد سے بنایا گیا تھا نقل و حمل کی دنیا میں آیا۔

اب وہاں عجیب خلقت سائیکل سڑکوں پر رواں تھے کسی کا پچھلا پہیہ اگلے پہیے کے مقابلے میں مزاحمہ خیز طور پر بڑا تھا۔ کوئی مکمل لکڑی سے بنا سائیکل تھا اور پھر خاص عورتوں کے لیے بنائے پہلے سائیکل پر اس نے مہکتی زلفوں کو اڑتے اور دور گم ہوتے دیکھا۔

”چلیں۔“ اسے خالی سڑک کو گھورتے دیکھا کہ آرٹھ مسکرایا۔

”زندگی خوبصورت ہے۔“

”ہاں بہت۔۔۔“

اس کے سامنے وہ دو لوگ اپنے بازوؤں پر پرندوں کے پر باندھے چھلانگ مارنے کو تیار تھے۔ اس نے حیرانی اور بے یقینی سے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔

”کیا انسان کو تجسس اتنا بے تاب کر سکتا ہے کہ وہ اپنی جان کی بھی پرواہ نہ کرے۔ کیا زندگی

تجسس کی وجہ سے قائم ہے اور اگر یہ نہیں تو موت بہتر لگتی ہے۔“ وہ سوچتی رہی سوچتی رہی یہاں تک کہ انہوں نے بلندی سے چھلانگ لگادی۔

پھر دو بھائی (رائٹ برادرز) بغیر انجن پہلا جہاز اڑاتے نظر آئے۔ پیچھے کہیں دھند کے پار شوکار تلپڑے جو بمبئی میں سنسکرت ادب اور ویداس کے پروفیسر تھے بغیر پائلٹ کے جہاز بنانے میں مصروف نظر آتے رہے۔ اس کے سامنے جو جہاز اڑ رہے تھے زیادہ تر ککڑی اور ترپال اور تاروں سے بنے تھے جن کے دو یا اس سے زیادہ پر تھے۔ پھر زن سے پاس ایک سادہ سا چھوٹا طیارہ پہلی غیر ملکی پرواز کرتا نظر آیا۔ کچھ ہوائی جہاز پانیوں پر لینڈ کر رہے تھے لوگ انہیں اڑتی کشتیاں (Flying Boats) پکارتے تھے پھر آواز کی رفتار سے تیز اڑنے والا پہلا طیارہ اس کے سامنے قلابازیاں کھاتا گزرا۔ ڈی ہاویلینڈ کو میٹ (De Havilland Comet)

دھات سے بنا پہلا جہاز اس کے قریب سے گزرا اور سامنے کریش ہو گیا وہ دہل کے پیچھے ہٹی۔
”ہاں اس کو ری ڈیزائن کیا گیا تھا بعد میں یہ والے جہاز بہت کریش ہوتے تھے۔“ آرٹھ کی آواز آئی۔

اسے سنبھلنے میں کچھ وقت لگا یکدم وہیں زمین آسمان غائب ہو گئے اس کے سامنے ارد گرد بڑے حجم کے سواری والے ہوائی غبارے اڑنے لگے۔

”اور کیا ہوا اگر ہم کچھ ایسا بنائیں جس سے ہم ہوا میں تیر سکیں۔“ یہ کس کی آواز تھی وہ جان نہیں سکی۔ اسے وہیں وہ پہلا ہوائی غبارہ اڑتا نظر آیا جو بطور تجربے کے اڑایا گیا تھا۔ اس میں ایک بطخ، بھیڑ اور مرغاسوار تھے۔ اس کے بعد لیون فلپ ٹیسیرینسکا پہلا ہائیڈروجن بیلون اڑتا نظر آیا اس میں بیٹھے لوگ فضائی مطالعہ کرنے میں یوں محو تھے جیسے آسمان کتاب اور ہوا، بادل اس کے ورق ہوں۔ ۱۷۸۳ میں مونجو لیفہیہ برادرز ہوائی غبارے میں پرواز کرتے نظر آئے۔۔۔ پہلی انسانی پرواز پھر جدید دور شروع ہوا

۱۹۳۱ میں اگست بیکارڈ نے ہوائی غبارے میں پندرہ کلومیٹر زمین کے اوپر پرواز کی۔ ۲۰۰۵ میں وجے پت پرواز کانیا ریکارڈ بناتا نظر آیا۔ اور پھر یہ اس کا اپنا دور تھا ۲۰۱۵ جس میں اسے سورج کی روشنی کی مدد سے اڑتا ہوائی غبارہ نظر آیا۔

ابھی وہ اسی رنگین آسمانی دنیا میں کھوئی ہی ہوئی تھی کہ ہر طرف سیاہی پھیل گئی اس نے چونک کر آرشی کی طرف دیکھا اس نے نظریں چرائیں۔

”اصل میں زندگی تب سمجھ آتی ہے جب ہم اس کا ہیبت ناک پہلو دیکھتے ہی۔“ وہ سپاٹ چہرے سے بولا۔ وہاں دھواں تھا، جلتے جسموں کی بو تھی، آہیں اور سسکیاں تھیں۔ یہ دوسری جنگ عظیم کا دنیا کا منظر تھا اس کو شہر شہر میں ہوتی تباہی نظر آرہی تھی اسے یقین نہیں آیا اس نے ایٹم بم کے دھماکے اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتے دیکھے۔ اس کے ارد گرد اڑتے جیٹ اور ہیلی کاپٹر کا شور تھا۔

وہ شاید اس کائنات کی سب سے زیادہ خوفناک آواز تھی شاید ایسی ہی کوئی چیخ تھی جو قوم ثمود نے سنی تھی اور ساکت ہو گئے تھے مگر یہاں تو سب بھڑبھڑا رہا تھا۔ فرشتے انگلیاں دانتوں میں دابے شاید دہراتے ہوں۔

”ہاں یہ وہی ہے جس نے زمین پر خون بہانا تھا۔۔۔ فساد کرنا تھا کہ اسے تو جزیروں کی طرف دھکیلنے کا حکم بھی نہیں۔“ وہ ان آہوں سسکیوں کے جنگل میں پتا نہیں کتنی دیر دوڑتی رہی۔۔۔ سیاہ دھوئیں میں، بارود کی بدبو میں، خونی آسمان تلے جہاں موت پر پھیلائے اسے رحم بھری نظروں سے تکتی تھی کہ اتنے مردوں کے درمیان ایک زندہ کا پھرنا وحشت ناک تھا اس کا مردہ ہو جانا بہتر تھا۔ یکدم اس کی آنکھ کھلی تھی گھٹی گھٹی سسکیوں کے درمیان وہ اپنے بستر پر تھی، رات کا تیسرا پہر تھا اسے آرشی کے ساتھ کیا اپنا سارا سفر یاد آیا۔

”تو یہ یاد سفر تھی۔“

اس نے اپنے اوپر سے کمبل ہٹاتے ہوئے وقت دیکھا ساڑھے تین ہو رہے تھے پھر کھڑکی کے پاس آکر پردہ ہٹایا، شاہ بلوط کا درخت زرد سانس کی آواز سے گونج رہا تھا ہلکی ہلکی برف باری اب بھی جاری تھی۔ وہ کمرے سے باہر آگئی گھر کے اندھیروں میں کئی منٹ بلاوجہ آوارا گردی کرنے کے بعد اماں کے کمرے میں داخل ہوئی کہ وہ کھڑکی اسے وہیں سے نظر آتی تھی۔ ہسپتال کی شیفٹس انہیں بے حد تھکا دیتی تھیں وہ گہری نیند میں تھیں۔ اس نے جھک کر ان کے پاؤں چومے اور دھیرے سے کمبل درست کیا پھر پردے کی اوٹ سے دور دھند میں چھپے مکان کی کھڑکی کو دیکھنے کی سعی کی، وہاں بتی روشن تھی کتنی دیر اس نے دیکھا اسے یاد نہیں بس جب واپس پلٹی تو ٹانگیں دکھ رہی تھیں اور پانچ بجنے والے تھے۔

”میرے خیال میں تمہیں کالج میں ایڈمیشن لے لینا چاہیے، تمہارے ابا کا بھی اصرار ہے۔“ ڈاکٹر نیرہ نے جو سگلاس میں ڈالتے ہوئے کہا۔ وہ خالی الذہن انہیں دیکھتی رہی جیسے اس نے کچھ سنا نہ ہو، اس نے واقعی نہیں سنا تھا۔

”ابا آتے ہیں تو میں تمہارا داخلہ کرواتی ہوں۔“ وہ اس کا جواب نہ پا کر دو ٹوک لہجے میں بولی تھیں۔ اس نے اب کی بار بھی کوئی جواب نہیں دیا تھا اس بار ان کی بات سن لی تھی۔ توں پر جیم لگانے لگی تھی۔

”تمہارا بی بیو بہت عجیب ہوتا جا رہا ہے۔“ اب اماں کے ماتھے پر بل پڑے تھے۔

”نہیں تو میں ٹھیک ہوں۔“ وہ گھبرا کر بولی تھی۔ انہوں نے گہری سانس لی۔

”ایک بھی دوست نہیں ہے تمہاری سارا دن پتا نہیں کیا کرتی رہتی ہو۔ تمہاری تائی اماں بھی شکایت کر رہی تھیں کہ گوگی کی برتھ ڈے پر جب ان کی طرف گئی تھی سارا وقت تم خاموش بیٹھی رہی ایک بھی بات نہیں کی تم نے وہاں کسی سے۔“

”کی تھی میں نے باتیں۔۔۔ سب کا حال پوچھا تھا بلکہ گلے بھی ملی تھی اور۔۔۔“ انہوں نے اپنا

سرپیٹ لیا تھا۔

”اور ساتھ والی آنٹی وہ بھی کہہ رہی تھیں اپنی بیٹی کو تھوڑا سوشل کریں۔“ اسے یکدم گھبراہٹ اور چڑنے گھیرا تھا۔



”کیا ہو رہا ہے؟“ وہ جو ہلکی ہلکی نم دیوار سے ٹیک لگائے مراقبہ کی حالت میں بیٹھی تھی چونکی مگر آنکھیں نہیں کھولیں۔

”میں سوچ رہی ہوں۔۔۔“

”کیا؟“ آرشی نے دھوپ کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

”یہی کہ پڑوسی میرے بارے میں کیا سوچتے ہیں اور ان کی بلی اور پودوں کا میرے بارے میں کیا خیال ہے۔“ آرشی نے دانت نکالے۔

”آج کلاس ہوئی ہے۔“ وہ مسکرا دی۔

”وہ چاہتی ہیں میں پھر سے ایڈمیشن لے لوں۔“

”ہمارے نبی ﷺ نے فرمایا ہے بچے کہ قیامت آجائے اور تمہارے ہاتھ میں پودا ہو تو لگا دو۔“

اس نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ ”کیا تمہیں لگتا ہے کہ میرے ہاتھ ایسے ہیں کہ ان سے لگا

کوئی پودا نشوونما پائے گا۔“

”ہاں مجھے یقین ہے کہ ان ہاتھوں سے لگا کوئی ایک پودا پھل دار درخت ضرور بنے گا۔“ وہ کچھ

بولی نہیں۔

”تو مجھے کیمسٹری رکھنی چاہیے پھر مجھے پیرویوٹک ٹیبل اور یہ اتنے سارے عناصر بہت فیسینٹیٹ

کرتے ہیں۔ اور روشنی اور نمک والے سارے تجربات۔“ وہ یکدم پر جوش ہو گئی تھی۔

”ڈن۔“

”چلو آج تمہیں کیمیا کی دنیا کی سیر کروا تا ہوں آخر اس کائنات کا وجود کیمیا گری پر بھی زبھر کرتا

ہے۔“

”کیا تم اس سائیں سے ملنے چلو گی جسے دنیا کے دریافت شدہ عناصر مکمل ترتیب کے ساتھ جدول

کی شکل میں خواب میں دکھائے گئے ہاں میں پیر یوڈک ٹیبل کی ہی بات کر رہا ہوں۔“

”اور بھلا کیا جواب کی آپ کو جاننے کی ضرورت ہے؟“ سیاہ آسمان میں یونیکورن کے سفید بال

لہراتے تھے ان کے گرد ستارے تھے جو جھلملاتے ان کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔

یہ سینٹ پیٹرز برگ روس میں انیسویں صدی کا زمانہ تھا جہاں ایک باریش شخص نے گھر میں

تجربہ گاہ بنا رکھی تھی جو شہر کی بڑی یونیورسٹی میں علم کیمیا کا پروفیسر بھی تھا۔ وہ نامیاتی کیمیا کے علم پر ایک

کتاب لکھ چکا تھا اور اب دوسری کی تیاری میں تھا۔ اسے عناصر کے دو گروپس کی خصوصیات کے بارے

میں لکھتے ہوئے احساس ہوا کہ عناصر گروپس میں اگر اپنے ایٹمی وزن کے حساب سے لکھے جائیں تو ان کی

خصوصیات بتدریج بدلتی ہیں اس طرح عناصر کے گروپس بھی ترتیب سے لکھے جاسکتے ہیں۔ حتیٰ کہ جو

عناصر ابھی دریافت نہیں ہوئے تھے وہ اس ان کی بھی خصوصیات اس قانون کے تحت بتا گیا۔ جیسے کوئی

تمہارے پیدا ہونے سے پہلے تمہاری گواہی دے دے۔ تمام دریافت شدہ عناصر کو اس دور میں ایک

جدول کی صورت میں ترتیب دیا جا رہا تھا۔ اس وقت تک اگرچہ بہت سے پیر یوڈک ٹیبل بنائے گئے مگر

ان میں نقائص رہ جاتے تھے، عناصر صحیح جگہوں پر نہیں تھے۔ جن دنوں مینڈلیو عناصر کی ترتیب پر کام کر

رہا تھا اس نے ایک خواب دیکھا تھا۔

”میں نے خواب میں ایک جدول بننے دیکھا اس میں تمام عناصر اپنی اپنی جگہوں پر آکر ٹھہرتے جا

رہے تھے۔“ وہ دونوں اس سائیں کے خواب میں پھرتے اس کا خواب دیکھتے رہے۔

”علم کیمیا صدیوں میں مصر اور عرب سے یونان اور روم منتقل ہوا۔“ وہ سینٹ پیٹربرگ کی صدیوں پرانی نیلی برفوں میں چہل قدمی کرتے باتیں کر رہے تھے۔

”اور پھر یہ مغرب اور مرکزی یورپ تک پہنچا۔ عربی لفظ ”الکیمیا“ کا مطلب پتھر یا جادوئی دوائی تیار کرنا ہے۔ کیمیا لفظ کھیم سے نکلا جو نیل کے ساحل پر سیاہ مٹی ہے۔“

آرٹھ نے اسے وہ ساری علامتیں پتھروں پر کھدی ہوئی دکھائیں جو اس وقت کے لوگ عناصر کے لیے استعمال کرتے تھے۔ آگ، ہوا، پانی، زمین، چاند، مرنج، ذہرہ، مشتری، سیٹرن، یورینس نیپٹیون، سورج، تانبا، بلور، سونا، لوہا، سیسہ، چونا، مقناطیس، تیل پلیٹیم، نمک، چاندی، صابن، چینی، ٹن، سرکہ، موم ہر ایک چیز کے لیے علامت مقرر تھی۔

”ان علامتوں میں ایک مقدس علم ہے سارا اگر تم سمجھو تو۔“

”مجھے مادام کیوری سے ملنا ہے۔“ اچانک بچپن کا عشق جاگا تھا۔ چھوٹے ہوتے اس نے مادام کیوری پر کارٹون سیریز دیکھی تھی۔

”اس سے پہلے ڈورٹی ہاجکن سے ملو۔“ وہ اسے کسی ہال میں لے آیا تھا جہاں وہ نوبل پرائز وصول کر رہی تھیں۔

”مجھے زندگی بھر کے لیے علم کیمیا اور بلوریں دنیا نے محصور کر لیا تھا رہائی ناممکن تھی۔“ اس نے ڈورٹی کو کہتے سنا۔

آرٹھ نے اسے انسولین (ایک مادہ جو خون میں شوگر کا لیول متوازن رکھتا ہے) کا وہ تین جہتی پیٹرن دکھایا جس تک پہنچتے ڈورٹی کو پینتیس سال لگے تھے۔

”ساری خوبصورتی توازن کی ہے جو ساخت میں ہے کائنات کی ہر چیز کی ساخت میں۔۔۔ آسمانوں سے لیکر ڈی این اے تک۔۔۔ فیثا غورٹھ نے صحیح کہا تھا کہ تاروں کے ساز میں جیومیٹری ہے اور

دائروں کے درمیان فاصلوں میں ساز ہیں۔“ سارا خود کلامی والے انداز میں بولی تھی۔
 ”اور کیا کسی نے تمہیں یہ نہیں بتایا کہ اس کائنات کی سب سے پرکشش چیز کیا ہے؟“ آرٹھ نے
 پوچھا تھا۔

”کیا؟“ اسے تجسس ہوا۔

”دل سے پھوٹی حقیقی خوشی۔“

”اور یہ چرخِ فلک کیا ہے؟ اس چرخ کا رخ کسی طرف تو ہے کس طرف یہ کون جانے۔ اس کی
 کوئی منزل تو ہوگی کیا وہ منزل خوبصورت ہے یہ کون جانے۔“
 ”ابھی سے تھک گئی ابھی تو مجھے کچھ اور بھی دکھانا ہے۔۔۔ روشنی اور بجلی۔۔۔ ماضی۔۔۔ مستقبل
 ۔۔۔“

”میرا مستقبل؟“

”نہیں دنیا کا مستقبل اور روشنی کا ماضی، اپنا مستقبل تمہارے ہاتھ میں ہے جیسے چاہو بنا لو۔“
 ”او تمہیں زندگی کا ایک نیاروپ دکھاؤں۔“ وہ اس کو پتا نہیں کہاں لے آیا تھا جہاں اس نے اپنے
 ذہن میں نہیں اپنے سامنے آواز کو مجسم ہوتے دیکھا تھا۔ آواز کی لہروں کا وہاں وجود تھا۔
 ”یہ خدائی طریقہ ہے ہمارے اعمال کو ریکارڈ کرنے کا ہے نا آرٹھ۔“
 پھر اس نے اسے روشنی کو مجسم ہوتے دکھائی۔

وہ گھسنے جنگل کی خوشبوؤں میں تھی جہاں جگنوؤں کا عالم آباد تھا۔ وہ ننھے ننھے روشنی کے کیرے
 اس کے ارد گرد منڈلاتے تھے اس فضا میں جادو کا اثر تھا یا واقعی وہاں مشک بار سفید پھولوں کی پتیاں
 درختوں سے اس پر گرتی چلی جا رہی تھیں۔ وہاں ہری چمکتی کائی زمین پر پھیلی تھی وہ پھسلنے کے ڈر سے
 سنبھل سنبھل کر اس پر چلتی تھی۔ اس نے سمندر کے گھسنے اندھیروں میں نور دیکھا وہاں جگنوؤں کی طرح

روشنی بکھیرتے جاندار تھے۔ یہ سب اس حیاتیاتی مادے کی وجہ سے چمکتے تھے جو روشنی خارج کرتا ہے۔ سمندر پر ستاروں کی چھایا تھی۔۔۔ ستاروں پر کس کی چھایا ہے؟

”یہ نور۔۔۔ یہ نور کہاں سے آیا ہے آرش۔ زمین پر نور کہاں سے آیا ہے؟ اس کائنات کا نور کہاں سے آیا۔“

”یہ خالق کا نور ہے اس کی زیر اثر ہر چیز روشن ہے۔ یہی نور زندگی ہے۔۔۔“

وہ اسے ایک سرمئی منظر میں لیکر داخل ہوا جہاں ایک حسین عورت بڑے بڑے کڑاہوں میں جانے کیا آمیزہ پکاتی تھی۔۔۔ اسے دھویں کی پرواہ نہیں تھی نہ زہریلی بو کی۔ جس نے جانے کتنی مشقتیں اٹھا کر تعلیم لی تھی وہ رات کو اپنے محبوب شوہر کے ساتھ اپنے تیار کردہ وہ تابکاری مادے نکلتی تھی جو رات کو روشن ستاروں کی طرح اس کے کمرے میں چمکتے تھے۔ ریڈیم اور پولونیم ایک کا نام شعاع یعنی انگریزی لفظ رے سے اخذ کیا گیا اور دوسرے مادے کا اس کے وطن پولینڈ سے۔ دونوں نے مل کر یہ دونوں مادے دریافت کیے تھے۔

”اور یونہی ایک دن ایک شخص جس کا نام چارلس تھا پارک میں بیٹھا سورج کی روشنی میں نہائے پھولوں کے مشاہدے سے لطف اندوز ہو رہا تھا جب اٹھا تو ایک ایسی تھیوری لیکر اٹھا کہ جس سے لیزر ایجاد ہوئی یک رنگی، شدید تیز روشنی کی لکیر جس سے جراثیم، سنگنز، کاٹنے اور علاج کے لیے استعمال کیا گیا۔“ آرش اب اسے اس منظر سے نکال کر ایک اور منظر میں لے آیا تھا حالانکہ چائے تو وہ مادام کیوری کے ساتھ بھی پینا چاہتی تھی گلیلیو کی طرح۔

اس نے اپنے سامنے لیزر کے تجربات ہوتے دیکھے۔

”یہی سب بنیاد ہے مصنوعی روشنی کی۔۔۔ بجلی کیا ہے۔۔۔ ننھے ننھے ذرات کا برقی چارج لیکر چلنا۔ فضا میں ہوا زیادہ تر اس بہاؤ کو روک کر رکھتی ہے مگر کبھی کبھی یہ اتنا زیادہ ہو جاتا ہے کہ یہ ہوا پھاڑ

دیتا ہے اور سپارک پیدا ہوتا ہے۔ یہی آسانی بجلی ہے۔

ابھی پچھلی صدی میں ایک مٹی کا پیالہ دریافت ہوا ہے۔ ”اس نے اس کے ہاتھ میں ایک پرانا پیالہ پکڑاتے ہوئے کہا۔

”جس سے سائنسدان سوچتے ہیں کہ بجلی کا نظریہ اور استعمال پرانے لوگوں میں بھی تھا۔ دو ہزار سال پرانے اس پیالے میں رائگ سے بنے مرکب اور لوہے کی سلاخ تھی۔ اس کو بجلی پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے اگر اس میں تیزابی سیال جیسا کہ سرکہ بھر دیا جائے۔“

”تو کیا دو ہزار سال پہلے بجلی تھی۔۔۔“

”نہیں یہ مفروضہ ہی ہے۔ اگر کچھ تھا بھی تو بہت نازک پیمانے پر تھا۔

گلوبٹ اور براؤن وہ پہلے سائنسدان تھے جنہوں نے سترہویں صدی میں بجلی کا لفظ استعمال کیا۔“

پھر وہ اسے بجلی کی کڑک سے چمکتے، دہلتے آسمان تلے لے آیا جہاں سیاہ بادلوں سے پھوار جاری تھی۔ وہاں اس نے فریسنکلن کو دیکھا۔ یہ وہ تاریخی شخصیت تھی جس نے بجلی کا ہونا ثابت کیا تھا۔ وہ پٹنگ اڑا رہا تھا۔ اس نے پٹنگ کے ساتھ دھاتی ڈور کا استعمال کیا تھا۔ آسانی بجلی اس دھات سے سفر کرتی اس تک آئی اسے شدید جھٹکا لگا یہاں اس نے بجلی کا وجود ثابت کر دیا تھا۔

پھر وہ اسے تھامس ایڈیسن کی تجربہ گاہ میں لیکر آیا جہاں پہلا بلب روشن ہوا تھا۔۔۔ جس کی وجہ سے آج ہماری دنیا روشن ہے۔

اس سب کے بعد وہ اسے ساحل سمندر کھیلتے بچوں کے پاس لے کر آیا تھا۔ وہ ایک پیالے کو تھامے ہوئے تھے اور اس میں ہارنے والے بچے کا ہاتھ ڈالتے تھے۔۔۔

”تم بھی ہاتھ ڈال کر دیکھو۔“ سارا نے ڈرتے ڈرتے ہاتھ ڈالا اس کا جھٹکا لگا۔ اس نے حیرت سے

اندر جھانکا وہاں اندر ایک مچھلی تیر رہی تھی، الیکٹرک کیٹ فش۔

اور پھر اس نے سمندر میں تیرتی برقی مچھلیاں دیکھیں۔ وہ بجلی پیدا کرتی تھیں۔۔۔ اور دوسری مچھلیاں اس برقی فیلڈ کا شعور رکھتی تھیں۔ الیکٹرک ایل، رے اور کیٹ فش ۱۰ سے ۶۰۰ واٹ بجلی پیدا کر کے شکار کو مار سکتی تھیں۔ وہ حیران تھی انسان تو صرف سائے پکڑتا ہے حق تو قدرت ہے۔ روشنی پیدا کرنے والے حیاتیاتی مادے کی طرح برق پیدا کرنے والے اعضا ہیں۔

”اٹھارہویں صدی میں الیکٹرک ایل اور ٹورپیڈو فش رائل سوسائٹی پپرز کے موضوعات تھے جس کے مطالعے نے لوئیجی گیلوانی اور ولٹا کوئے طرز پر سوچنے میں مدد دی جو کہ الیکٹروفزیالوجی اور الیکٹروکیمسٹری کے بانی ہیں۔“

سلسلہ در سلسلہ

روشنی کا دائرہ

لولہ در لولہ

زندگی کا دائرہ

”زندگی سونے جاگنے کا عمل نہیں ہے دھکے کھانے، زخمی ہونے، جل جانے کا عمل ہے۔ سانپ کی طرح وقتاً فوقتاً کینچلی اتارتے جاؤ، گھاؤ پر فخر کرو۔“ وہ بولتے ہوئے اس کی نم ہوتی پلکیں نہیں دیکھ سکا تھا۔

”اس چرخ فلک کی طرز پر دس ہزار سال قبل مسیح پہیہ بنایا گول گول دائرے میں گھومتا، حرکت کرتا آگے بڑھتا، آگے بڑھتا۔۔۔ یہ کس منزل پر پہنچائے گا یہ انسان جانتا ہے مگر سمجھتا نہیں

ہے۔ سائیکل، گاڑی، موٹر سائیکل، ریل گاڑی سب اسی کی مرہون منت ہے۔“

سارا کے سامنے زن سے ٹیوب ٹرین گزری، سفیریکل ٹائر حرکت کرتے نظر آئے جو برقی قوت سے چلتے تھے یوں کہ برقی قوت درمیان میں موجود دھات

پر اثر انداز ہو کر اسے حرکت کرواتی تھی۔ اور پھر آرٹھ نے اسے جو دکھایا اس کے جسم میں سنسنی سی پھیل گئی یہ مزید مستقبل تھا پتا نہیں اس نے تب تک زندہ رہنا تھا یا نہیں لیکن وہ ہوائی راستوں پر چلتی گاڑیاں دیکھ رہی تھی۔

پھر اس نے دیکھا وہاں ایک بڑا سرخ رنگ کا روبوٹ باتیں کرتا تھا۔

”۱۹۶۰ میں روبوٹ کا صرف بازو تیار کیا گیا تھا جس کو ایک مقناطیسی ڈرم کے ذریعے ہدایات دی جاتی تھیں۔ ۱۹۶۹ میں اسے کمپیوٹر سے کنٹرول کیا جانے لگا اور اس میں مزید اضافے کیے گئے۔“ آرٹھ اسے بتا رہا تھا۔

روبوٹ کی ابتدا ایک سائنس فکشن مووی سے ہوئی تھی جس میں ماریہ نامی روبوٹ دکھایا گیا وہ ۱۹۲۷ کے مووی تھیٹر میں تھی اور ماریہ کو سکرین کے پردے پر دیکھ سکتی تھی۔ مووی کا تھیم تھا کہ صنعتی بڑھوتی کے ساتھ مزدوروں سے مشینوں کی طرح کام لیا جائے گا۔ پھر اس نے کھلونوں کی فیکٹری میں روبوٹس بنتے دیکھے، آرٹیفیشل انٹیلیجنس (مصنوعی ذہانت) پر کام ہوتے دیکھا جس تکنیک کے ذریعے روبوٹس

محسوس کرتے تھے، حرکت کرتے تھے، موقع محل پر ان کا قابو تھا، رابطہ کرتے تھے اور اپنے فیصلے خود کرتے تھے۔ اسے بے اختیار میٹرکس مووی یاد آئی وہ جھر جھری سی لیکر رہ گئی۔

”کیا فکشن حقیقت کا روپ دھار سکتی ہے؟“

”ہاں دھار سکتی ہے۔“ وہ سوچ میں غلطاں تھیں آرٹھ نے اس کی سوچ پڑھتے ہوئے اسے جواب

دیا۔

”انسان وہی سوچتا ہے جو ممکن ہو سکتا ہے۔“

”آئزک ایسمو (Isaac Asimov) نے تین روبوٹس قوانین دیے تھے۔ جس کا پہلا قانون تھا کہ نہ تو روبوٹس انسان کو نقصان پہنچائے اور نہ انسان کو کوئی ایسا کام کرنے دے جس سے اسے نقصان پہنچے۔ اور امید ہے کہ روبوٹس کی دنیا اسی قانون پر چلے گی۔۔۔“

”شاید۔“ وہ سر ہلا کر رہ گئی۔

”یہ روبوٹ کا خیال آیا کس کے زرخیز دماغ میں تھا؟“

”۱۹۲۱ میں کیرل کیسپک نے پہلی دفعہ لفظ ”روبوٹا“ استعمال کیا تھا غلام مزدوروں کے حوالے سے“

اس کے سامنے قدیم جدید روبوٹس کے عکس بننے مٹنے لگے۔ پیپر پر

آئزک ایسمو کے ہاتھوں سے بنا روبوٹ، ایک پرانی فلم کے اشتہار میں ابھرتا روبوٹ۔ عربی سائنسدانوں کے سنہری دور میں پیچیدہ گھڑیاں جو کہ خود کار طریقے سے چلتی تھیں ہاتھی گھڑیاں جسے الجزاری نے

۱۱۹۶ سے ۱۲۰۶ کے درمیان بنایا اس کا عکس بھی روبوٹس کے عکس میں سنہرے جھلملاتا تھا۔



واپسی کے بعد دن چڑھے وہ سوتی رہی تھی۔ اگر اماں جگانے نہ آتیں تو شاید آج وہ اٹھتی ہی نہ۔ انہوں نے زبردستی اٹھا کر اسے بٹھایا تھا۔

”کیسے زرد چہرہ ہوتا جا رہا ہے۔“ انہیں بے اختیار وحشت نے گھیرا تھا۔

”میں ناشتہ بھجواتی ہوں فریش ہو جاؤ۔“

خانسا ماں کو ناشتے کا کہہ کر وہ ہسپتال فون ملانے لگیں، اس کے سارے ٹسٹ دوبارہ کروانا چاہتی تھیں۔



سارا ناشتے کے بعد چہل قدمی کرنے نکلی تھی۔ سڑک پر بلند ہوتے ہوئے اس نے دیکھا کوئی کپل وہاں کھڑا باتیں کر رہا تھا شاید ہنی مون پر تھے وہ لوگ۔ مرد نے ان کے گھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہاں گھوڑے کی باگ کھینچتے دور جاتے بابا جی سے دریافت کیا تھا۔

”یہ راستہ کہاں جا رہا ہے۔“

”صاحب جی گھر ہے۔“ وہ ان کے پاس سے گزر آئی۔

”گھر کس کا ہے؟“

”گھر کس کا ہوتا ہے؟“ بابا جی شاید برا مان گئے تھے

”کس کا ہوتا ہے؟“ مرد ڈھیٹ تھا۔

”یہاں آفیسرز کے گھر ہوتے ہیں۔“ آوازوں نے دور تک اس کا پیچھا کیا تھا۔

وہ جیکٹ میں ہاتھ ڈالے سر جھکائے کافی دیر چلتی رہی۔

”سارا۔۔۔“ شناساسی آواز سے چونکی۔

”اوہ۔۔۔ یہ میں یہاں کہاں نکل آئی۔“ اس نے شرمندگی سے خود کو فریز ہوتا محسوس کیا تھا۔

”کیسی ہیں آپ؟“

”ہنہ۔“ اس نے سر ہلایا۔

”اندر آئیے۔“ اس کے ماتھے پر بے اختیار بل پڑے تھے جو شاید اسے بھی نظر آئے تھے۔

”اندر آئیے امی کو کچھ دنوں سے آپ سے ملنے کی خواہش ہو رہی ہے۔“

”تو اس کو مجھ پر ترس آتا ہے۔“ اس کا دل چاہا دوڑ لگا دے مگر زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پر سجائے وہ خود کو روک کر کھڑی تھی۔

”میں آؤں گی اماں کے ساتھ ابھی تو جانا ہے۔“ سارا نے دیکھا اس کے ہاتھ میں سفید رنگ کا پھول تھا شاید ابھی ابھی توڑا گیا تھا۔ اگلے پل وہ پھول سارا کے ہاتھ میں منتقل ہوا تھا۔ اس نے حیرانی سے سر اٹھایا اسے لگا وہ جانتا ہے وہ اس وقت کیا سوچ رہی ہے۔ اس کے بعد وہ کیسے رک سکتی تھی۔ اسے پتا نہیں چلا کب تقریباً دوڑتے دوڑتے وہ بازار میں اس جگہ پہنچ چکی تھی جہاں سڑک پر کتابوں کا ڈھیر ہوتا تھا۔

وہاں قدموں میں کتابیں دھری تھیں، دکان کا مالک کچھ دور حقہ گڑا رہا تھا، ساتھ والی دکان میں گرم کرکڑا تے تیل میں پکوڑے تلے جارہے تھے ساری فضا میں مہک تھی۔

”اب اس کا کیا کروں۔“ اس نے پھول کو ہتھیلی پر تکتے ہوئے سوچا۔

”اسے مر جھا جانے دو۔“ آرٹھ نے کہا تھا۔ اس نے منہ بنا کر پھول جیب میں منتقل کر دیا اور نیچے بیٹھ کر کتابوں کے سرورق پڑھنے لگی۔

اقبالیات، نیرنگ، خوبصورت سفر نامہ ریگزاروں سے خوبصورت پہاڑوں تک، حباب کے ڈرامے، بولتی باتیں کرتی تحریریں، ہمالہ کے اس پار، جدید سندھی ادب، نقش دوام، نوشتہ وقت، محبت، از زمیں تا بہ آسمان سخن است۔ وہ کتابیں چننے لگی۔

”ان کے مصنفین اس وقت کہاں ہوں گے۔۔۔“ چنتے چنتے اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔

”یہ امتیاز علی تاج اور مرزا ادیب تو ظاہر ہے عالم ارواح میں۔“

”میں باقیوں کی بات کر رہی ہوں۔۔۔ یہ کتابیں یوں کیوں رُل رہی ہیں، کوڑیوں کے دام بک رہی ہیں۔ ان کے لکھنے والوں نے آنکھیں چُنی ہیں ان میں اپنی، یہ سیاہی کی بوندیں نہیں ہوتیں یہ زخموں

سے رستاخون ہے جوان صفحوں پر بکھرتا ہے۔“

”جانتے ہو کوئی لکھتا کیوں ہے؟“

”کیوں؟“ آرٹھ کے پاس کیوں کہنے کے علاوہ کو چارا نہیں تھا۔

”پیالہ بھرنے کے بعد پانی گرتا کیوں ہے؟ یہ سب پیالوں سے بہہ چکے پانی ہیں۔“

برف کی مہک میں اس کے ہاتھوں پر سفید پھول کا لمس جاگتا تھا، آنکھوں میں ایک کمرے کے سنہرے شیشے کا عکس تھا اور سڑک پر کتابوں کی طرح بکھرے خواب جنہیں وہ چنتی تھی۔ سمو سوں اور پکوڑوں کی اشتہا آمیز خوشبو گزرتے سیاحوں کو روک لیتی تھیں اور اس کی دکان پر گانا گونجتا تھا۔۔۔

ہیرا سوئی سراہیے
سہے گھنن کی چوٹ۔۔۔۔

ہیرا پارا بار میں
رہا چھار لپٹائے
کیستی مورکھ پھچی موئے
کوئی پارکھی لیا اٹھائے
صرف وہی ہیرا قابل تعریف ہے جو ہتھوڑی کی ضربیں سہہ سکتا ہے
ہیرا زمین پر گر کر گرد آلود ہوا

بے وقوف پاس سے گزرنے لگے

ایک نظر شناس نے مجھے پہچان کر اٹھالیا

”جانتے ہوا اگر اللہ مجھ سے پوچھتا کہ تم نے کیا بننا ہے تو میں کیا بنتی؟“

”کوئی پودا۔“ اس کا منہ کھل گیا اور پھر ہنسی کھل اٹھی۔

”پودا کیوں؟“

”شکل تو پودے جیسی ہے تمہاری۔“ وہ پھر سے ہنس پڑی تھی۔

”میں کسی آئینہ سی جھیل کی تہہ میں پڑا سبز پتھر بنتی جس پر آسمان کے ہر رنگ کا عکس ہوتا جس کا

لمس پانی اور خوشبو مٹی ہوتی۔“ اب کی بار وہ کچھ نہیں بولا۔

”جسے کوئی دیکھتا تو بس حیرانی سے ہی دیکھتا۔ یہ پتھروں کا جہان بہت عجیب ہے۔۔۔ بہت

خوبصورت۔۔۔ عجیب انداز میں فیسینٹ کرتا ہے۔“

”کیا اس دنیا میں کوئی چیز ایسی ہے جو تمہیں فیسینٹ نہیں کرتی؟“ آرٹھ نے مکھی اڑائی۔

”ہاں ہے۔ مجھے جن بالکل فیسینٹ نہیں کرتے۔“

آرٹھ نے اس دن اسے گھر پہنچتے تک پتھروں کا رنگین جہان دکھایا تھا

یا قوت جمری، امبر، فیروزہ، سلیمانی پتھر، نیلم، سنگ امیزن ایک سبز دلکش پتھر (جو دریائے

امیزن کے قریب پایا جاتا ہے)، حجر القمر، پکھراج، سنگ لاجورد، سرخ آہنی پتھر، کچا تانبا، خام سونا،

یشب رنگ پتھر، اوپل (دودیا ہتھر)، سنگ چینی، زمرہ، زرد سبز پتھر، کارنیر و پائٹن، الازگینڈرائٹ ایسا

پتھر جو دن کی روشنی میں سبز اور مصنوعی روشنی میں سرخ دکھتا ہے، اٹلی کے آتش فشاں پہاڑ کوہ

ویسویوس پر پایا جانا والا پتھر، سفید زرقون جو ہیرے کے مشابہہ دکھتا تھا اور شیشے سے بنے پتھر وہ بھی

ہیرا لگتے تھے۔ اس کی نظریں خیرہ ہونے لگیں اور یہ سیلکون، ایلومینیم، لوہا اور سونا اور تانبا یہ

دھاتیں۔۔۔ یہ سب کتنا عجیب ہے۔۔۔ کتنا محسوس کن۔

”جانتی ہو انسان نے دوسری چیزوں کی طرح پتھر بھی خود تخلیق کیے ہیں چلو چلتے ہیں میں تمہیں

دکھاتا ہوں۔“

”گھر پہنچنا ہے۔۔۔ اماں ڈانٹیں گی۔“

”تھوڑی دیر میں واپس آجائیں گے۔“

وہ اسے ایک ماہر کیمیا گر کی تجربہ گاہ میں لے آیا تھا۔

وہاں وہ فرانسیسی کیمیا گر جس کا نام اگست تھا ایک عمل کے ذریعے ایلومینا کے بورے کو ۳۶۰۰ ڈگری درجہ حرارت نیلم اور روبی میں تبدیل کر رہا تھا۔ کوئی اصل اور نقل کے بارے میں نہیں بتا سکتا تھا۔



”قائد اعظم یونیورسٹی میں میں نے تمہارا فارم جمع کروایا ہے کچھ عرصے تک لسٹ لگے گی اور پرسوں ہاسپٹل چلنا ہے تمہیں میرے ساتھ کچھ ٹسٹ کروانے ہیں روٹین کے۔“ اس نے خاموشی سے حکم نامہ سنا اور اثبات میں سر ہلایا۔ یہ بھی نہیں پوچھا داخلہ فارم میں کون سے مضامین لکھے ہیں۔

کمرے میں آکر اس نے شیف میں پڑی کتاب میں صبح سے جیب میں پڑا پھول منتقل کیا۔

”کہہ رہا ہوں اسے مرجھا جانے دو۔“

”یہ مرجھا چکا ہے۔“ اس نے کتاب کھول کر سامنے کی۔

”وہ لوگ مجھ پر ترس کھاتے ہیں۔“

”اور تم؟ یہ عجیب ہے۔۔۔“

”ہاں بہت۔“

”نا قابل فہم۔“

”بالکل۔“

اگلے پل وہ اپنے کمرے میں نہیں تھی ایران کے شہر شیراز میں تھی۔

”یہ کہاں لے آئے ہو۔“ وہ پریشان ہوئی اس نے آرٹھ کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا جہاں

گھٹنوں کے بل بیٹھا ایک مفلوک الحال ایک دوشیزہ سے محو گفتگو تھا۔ ”اس کی آنکھوں میں جو لو تھی وہ عشق تھی جس کا عکس دوسرے کی آنکھوں میں دکھائی دیتا تھا۔ یہ لیلیٰ مجنوں تھے اور وہ اس وقت سولہویں صدی میں شیراز میں تھی۔ وہ دھیرے دھیرے قریب گئی اور ان کی باتیں سننے لگی۔ اس نے لیلیٰ کے چہرے میں اپنا عکس دیکھا۔

پھر اس کے سامنے عرب کی وسیع قدیم سنہری دنیا آرٹھ نے کھول دی تھی۔ وہ اسے فضول کی باتوں، بے منزل بھول بھلیوں میں پھرنے کے لیے نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ وہ دور اس کے سامنے ایک پینٹنگ کے روپ میں نمودار ہوا جس میں کسی کے ہاتھ میں کتاب تھی، کسی کے ہاتھ میں اسطرلاب اور کسی کے ہاتھ میں سمت معلوم کرنے والے آلہ۔ جہاں یادگار کتابیں تقریباً ہر موضوع پر لکھی جا رہی تھیں۔ اسطرلاب بنائے جا رہے تھے اور شیشے کے سکے، جڑی بوٹیوں سے دوائیاں اور اوزار، زرد کاغذوں پر لکڑی کے قلم سے نسخے لکھے جا رہے تھے، مرتبان روغن کیے جا رہے تھے، خطاطی معراج پر تھی۔ اس نے وہاں گیارہویں صدی میں شیر کی شکل کی بنی کانس کی قدیل، دسویں صدی کا مصری پیالہ جس پر کوئی کندہ کاری تھی، اوزار، قلم دوات، قلم کو چھیلنے والے بلیڈ دیکھے۔ اپنی آنکھوں سے اس دور میں قالین سازی، شیشہ سازی اور کاغذ سازی ہوتے دیکھی۔ شیشہ سازی بے شک ایک مشکل اور مہارت والا کام تھا۔ لکڑی کے پلپ کو کاغذ بنانے کے لیے کوٹا جا رہا تھا وہ دلچسپی سے سارا عمل دیکھتی رہی۔

اس نے دیکھا تیرہویں صدی میں مسلمان روبوٹس پر کام کر رہے ہیں الجزائر نے اس دور میں پانی سے چلنے والی گھڑی بنائی۔

بنو موسیٰ مشینی آلے بنا رہے ہیں جن میں قابل ذکر سیلف ٹرمنگ لیمپ تھا۔

حنین ابن اسحق نے نویں صدی میں کتاب تصنیف کر رہے ہیں جس میں آنکھ کی تفصیلی ڈایا

گرامز تھیں۔

الزحراوی نے ۱۰۰۰ صدی میں ۲۰۰ آلات جراحی کی اپنی ۳۰ ولیم کی انسائیکلو پیڈیا میں تفصیل دے رہے ہیں۔

دسویں صدی میں الماجوسی طب کی کتاب لکھ رہے ہیں جس میں طبیب اور مریض کا تعلق اور نفسیاتی بیماری کو بھی ڈسکس کیا جا رہا ہے۔

ابن سینا طب کا انسائیکلو پیڈیا لکھ رہے ہیں۔

البیرونی چاند کے مختلف فیروز اپنی ۹۵ کتابوں میں سے ایک کتاب جو کہ حساب اور علم فلکیات پر ہے گیارہویں صدی میں لکھ رہے ہیں۔

چودھویں صدی میں شام میں الف لیلی لکھی جا رہی ہے۔ پھر وہاں ایک پینٹنگ کا عکس ابھرا ابن الاحناف گھوڑے کی صحت کے بارے میں ہدایات دے رہے تھے۔

پھر وہ ایک بڑی سی کتاب کے زرد صفحے میں داخل ہوئی جہاں مکمل ٹائم لائن موجود تھی وہ دھیرے دھیرے ٹائم لائن کے ساتھ سفر کرنے لگی۔ جس میں وقت کے ساتھ وہ کارنامے پہلی بار جو مسلمانوں نے سرانجام دیے لکھے اور ہوتے نظر آ رہے تھے۔ جو جدید سائنس کی بنیاد بھی بنے۔

۷۲۲ عرق کشی۔

۸۰۱ میں کیمیا گری۔

۸۲۹ میں صد گاہ کی تعمیر۔

۸۶۴ میں کیروسین بنایا جا رہا تھا۔

۸۷۲ میں قاہرہ میں ہسپتال بن رہا تھا۔

۹۰۰ میں مثلثیات کا علم (ٹریگنومیٹری) استعمال کر کے شمسی سال ناپا جا رہا تھا۔

۹۱۳ میں طب کی مشق کا اجازت نامہ جاری ہو رہا تھا۔

۹۴۳ میں جڑی بوٹیوں سے علاج عام تھا۔

۹۶۴ میں نکشتر یعنی تاروں کے جھر مٹ کے نام رکھے جارہے تھے۔

۹۸۵ میں سیاحت کو عروج حاصل تھا۔

۱۰۰۰ میں آلات جراحی کے بارے میں تفصیل سے لکھا جارہا تھا۔

۱۰۲۰ میں طب کا علم لاطینی زبان میں ترجمہ ہو رہا تھا۔

۱۰۲۵ میں طب کے قانون کی کتاب کی اشاعت جاری تھی۔

۱۱۲۶ میں طب کا انسائیکلو پیڈیا لکھا جارہا تھا۔

۱۱۵۴ میں دنیا کا نقشہ بنایا گیا جس میں تین براعظم تھے۔

۱۱۹۷ میں دوائیوں کے مقدار کو ریکارڈ کیا گیا۔

۱۲۱۳ میں پلمنری سرکولیشن تفصیل سے بیان کی گئی۔

۱۲۰۰ میں صابن بننے کا عمل عام ہوا۔

۱۲۶۳ میں سٹارکیٹا لوگ کمپائل ہوا۔

۱۳۲۵ میں سیاح چین اور مغربی افریقہ پہنچ چکے تھے۔

کتاب سے باہر قدم رکھتے اس نے ایک محفل سبھی دیکھی۔ وہ اسے خوش رکھنے کی خاطر کچھ بھی کر سکتا تھا۔ یہ نویں صدی کی محفل تھی۔ جس صدی میں ستار میں پانچواں تار شامل کیا گیا تھا۔ وہ اس قدیم عرب موسیقی کو سنتی رہی۔ وہ اسے کہے بغیر واپس لے آیا تھا اور جانے کیوں ستار کی لے جو پانچویں تار سے پیدا ہو رہی تھی وہ ساتھ لے آئی تھی۔



کچھ دنوں میں رپورٹس آگئی تھیں اس کے سارے ٹسٹ کلیئر آئے تھے، ڈاکٹر نیرہ نے سکون بھرا

سائنس لیا تھا اور اب یونیورسٹی میں بھی لسٹ میں نام آگیا تھا۔ اسے اپنی خالہ کے ہاں اسلام آباد میں اگلے تین چار سال ٹھہرنا تھا اور یہ بات اس سے ہضم نہیں ہو رہی تھی مگر اماں ماننے کو بالکل تیار نہیں تھیں۔ اسے آئے ہوئے دودن ہوئے تھے اس کی خالہ کی بیٹی زویا اسے ایسے دیکھتی تھی جیسے وہ کسی میوزیم سے اٹھا کر لائی گئی ہو اور وہ ایسی لگتی بھی تھی۔ کل اس کا یونیورسٹی میں پہلا دن تھا اسے زویا کے ساتھ ہی آنا جانا تھا وہ وہاں سے ایم سی ایس کر رہی تھی جبکہ اس کا کیمسٹری آنرز تھا۔

یونیورسٹی میں پہلے ہی دن وہ اپنے جیسے دو اور عجوبوں سے ملی تھی سارہ اور جمال۔ ہاں اس کا نام بھی سارہ تھا بس اپنا نام ہ سے لکھتی تھی اور جمال جس کے لمبے بالوں نے بڑے بڑے کانوں کو چھپا رکھا تھا، ذہانت سے چمکتی آنکھیں، اٹھی ہوئی ناک جیسے ابھی چھینک آجائے گی۔ وہ دونوں آپس میں کزنز تھے اور اب اس کے دوست۔

اس نے بہت عرصے بعد باہر انسانوں کی دنیا میں قدم رکھا تھا کسی کو اپنا دوست ماننا تھا چاہے کلاسز اینڈ کرنے کے لیے ہی صحیح۔ اسے ملچگی سی روشنی میں بند ہوتے کھلتے کلاس رومز کے دروازے، پرندوں اور سٹوڈنٹس کی بیک گراؤنڈ میں چلتی دھیمی دھیمی چچھاہٹ، اسانڈہ کے چہرے پر چھائی گہری سنجیدگی، لیکچرز کے دوران طلبہ کی شوخیاں اور شرارتیں سب اچھا لگتا تھا۔

”آج ہم نیشنل لائبریری جارہے ہیں تم چلو گی ساتھ کچھ بکس ایشو کروانی ہیں۔“
 ”اوکے چلتی ہوں۔“ وہ فوراً ہی مان گئی تھی۔ وہ زویا کو بتا کر ان کے ساتھ آئی تھی زویا کے ساتھ زیادہ تر وہ ڈنر پر ہی نکلتی تھی سینورس، صفات مال، صدر یہاں تک جانے کے لیے اس کے جوتوں میں گویا آٹومیٹک مشین فٹ تھی۔ شاپنگ کے لیے وہ ہر وقت ریڈی رہتی تھی اور سارا کے سیاہ سرمئی، ہلکے نیلے، سبز پھیکے پھیکے رنگوں کے کپڑوں سے اکثر اسے وحشت ہوتی تھی اس نے اسے خوب شاپنگ کروائی تھی مگر دودن بعد وہ انہیں کپڑوں میں لوٹ آتی تھی۔ میں کمفرٹیبل نہیں فیل کرتی یا یہ چونے

مجھے یہی سوٹ کرتے ہیں۔ اور وہ اکثر جو کام والی کو لیکر مار گلہ ہلز ہائیٹنگ کرنے چل پڑتی تھی یہ عمل زویا کے لیے ناقابل معافی تھا۔

گاڑی کو انسٹیٹوشن ایوینیو پر دوڑ رہی تھی شاہی عمارتیں زن سے منظر پر ابھرتی غائب ہوتی تھیں ایوان صدر، پارلیمنٹ ہاؤس، وزیراعظم ہاؤس، سپریم کورٹ اور پھر انہوں نے نیشنل لائبریری کے لیے موڑ کاٹا، ویران سڑک دائیں طرف سرسبز میدان میں کھڑے اداس شجر جن کے ساتھ نیشنل لائبریری آف پاکستان کا بورڈ لگا تھا۔ پارکنگ میں بھی قطار میں درخت تھے۔ اس نے دیکھا عمارت پرانی تھی مگر پروقار تھی۔ درختوں پر کہیں کہیں مردہ پتے تھے جو درخت کا ساتھ نہ چھوڑتے تھے۔ عمارت کے اوپر والے شیڈ زگدلے تھے جیسے بارش کا پانی اوپر کی ساری مٹی لیکر ان سے زمین پر گرتا ہو۔

سارہ اور جمال یہاں ممبرز تھے وہ بک ایشوز کروانے چلے گئے تھے جبکہ وہ آڈیٹوریم، نیشنل سبلو گرافی کی جگہیں دیکھتی رہی، ریڈنگ ہالز میں مٹر گشتی کرتی رہی، لنکن ریڈنگ لاؤنج دیکھنے کے بعد وہ سیڑھیوں سے اوپر گئی جہاں سرخ رنگ کے پارچمنٹ پر لفظ اقر کی خطاطی تھی، پھر دھیرے دھیرے چلتے اس نے سارے ریڈنگ ہال، مادرِ ملت، سرسید احمد، علامہ اقبال ریڈنگ ہال دیکھے۔

وہاں کل تین لاکھ کتابیں تھیں، ۵۸۰ ہاتھ سے لکھے قلمی نسخے تھے۔ ۱۰۰۰۰ ادب نایاب کتابیں بھی موجود تھیں جو مرحوم عبداللہ چغتائی، مرحوم احسان دانش، شیخ محمد فاضل (سکھر)، سید وجیہ الدین (فیصل آباد)، قاضی محمود الحق (لاہور)، ڈاکٹر گوہر نوشاہی (اسلام آباد) اور سرفراز خان (راولپنڈی) کے ذاتی کتب خانوں سے لی گئیں۔ ۳۰۰۰ مائیکرو فشر۔ جس میں بھارت کی مردم شماری کی رپورٹس ۱۹۱۱، ۱۹۳۱، ۱۹۲۱، ۱۹۴۱ کی موجود تھیں اور چالیس ہزار اخبار۔

واپس مڑتے ہوئے اس کی نظر کوریڈور میں اس کے ساتھ چلتی دیوار پر نصب دو پینٹنگز پر پڑی تھی جنہیں دیکھتے وہ ساکت ہوئی تھی۔

پینٹنگ میں قدیم زمانے کو تصور کیا گیا تھا آسمان پر تاروں کے جھرمٹ، غار کے دہانے پر کھڑا انسان، اوزار، قدیم تحریریں جو پتھروں پر کھود کر لکھی گئی تھیں، چکرو یو اور مٹی کے برتن۔ اس نے ایک ہتھیلی کے لمس میں، ایک نگاہ میں، چند لمحوں میں پوری ایک تاریخ جی لی تھی۔ رنگ سانس بن کر اس کے اندر سفر کر گئے تھے۔ دوسری پینٹنگ میں

ایک شجر تھا جس پر بھورے قدیم کاغذ چسپاں تھے ایک پر سورۃ العلق کی چند آیات درج تھیں، ”پڑھو، اپنے پروردگار کے نام سے۔

جس نے انسان کو خون کی پھٹکی سے بنایا۔

پڑھو اور تمہارا پروردگار بڑا کریم ہے۔

جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا۔

اور انسان کو وہ باتیں سکھائیں جس کا اس کو علم نہ تھا۔“

ایک کاغذ پر انگریزی حروف تہجی درج تھے اور شجر کے ساتھ ہوا میں اردو حروف تہجی معلق تھے۔ ایک کاغذ پر کہکشاں کی تعریف درج تھی۔

”کہکشاں ستاروں کی دھول، مٹی اور اربوں اور بعض اوقات کھربوں ستاروں کے مجموعے کو کہتے ہیں جنہیں کشش ثقل ایک دوسرے سے دور نہیں جانے دیتی۔ کہکشاں کو سوچو کہ وہ ایک عظیم خلا میں تیرتا جزیہ ہے یہ لاکھوں سال کی دوری پر موجود ہے۔“

ایک چاند تارا تھا اور ایک شیشہ ساعت جس سے تارے یوں پھوٹتے ہوئے نکل رہے تھے جیسے کسی ضخیم بلیک ہول میں کسی عظیم دھماکے کے باعث اس کے کناروں کی فضاؤں میں وجود پا کر کائنات کی شاہراہوں پر نکلتے ہوں گے۔ سیاہی مائل نیلا ہٹ میں ستارے اور سیارے محو گردش تھے جیسے اوم کے، صمد کے وجد میں ہوں۔ ایک کشتی میں چند کتابیں اور قلم یوں محو سفر تھیں جیسے دور راز کہیں کوئی انسان

اپنے بدن کو پتوں سے ڈھانپنے ان کے لیے محو انتظار ہو، تاریخ کائنات، دنیا کا انسائیکلو پیڈیا اور دنیا کی تاریخ کی کتابوں کے ساتھ گلوب پینٹ تھا اور ساتھ ٹیب اور لیپ ٹاپ۔ لیپ ٹاپ اور کتاب انسانی دماغ سے ڈی این اے نما بجلی کی تاروں سے رابطے میں تھا اور شجر اور چاند تار ارب زدنی علما کی خطاطی سے جڑے تھے۔ اس نے سعی کی تھی اور وہ جان گئی تھی۔ کونے میں اس نے مصور کا نام پڑھا، خراج تحسین پیش کیا اور آگے بڑھ گئی۔

ایک پرانے اخبار کی بوسیدگی اس کے دماغ پر چھاتی گئی تھی۔ اتوار ۲ جولائی وین گاف جو کہ ڈچ پینٹر تھا اس نے سینتیس سال کی عمر میں خود کو کھیتوں میں گولی مار لی تھی، دو دن بعد اس کا اپنے کمرے میں انتقال ہوا۔ ونسینٹ نے اپنی زندگی میں آٹھ سو تصویریں پینٹ کیں جس میں سے صرف ایک اس کی زندگی میں بچی۔ اعزازی طور پر اس کے ماڈرن آرٹ کے بانی ہونے کا اعلان کیا گیا، اس کے نام پر ایک میوزیم کا قیام عمل میں آیا جہاں لوگ اس کی مصوری کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔

تاروں، تاروں بھری رات

اپنے سیلٹ کونیلے اور زرد رنگوں سے بھرو

باہر گرما کے دن کو دیکھو اپنی آنکھوں سے

جو میری روح کے اندھیروں کو جانتی ہیں

پھاڑیوں پر سائے

خاکے بناؤ شجر کے اور نرگس کے

ٹھنڈک اپنے اندر اتارو ہوا تمہیں چھو لے

ان رنگوں میں جو برف زار میں ہیں۔۔۔

کیسے تم نے اپنے شعور کا خراج دیا

ان کو آزاد کر دیا۔۔۔

وہ ہولے ہولے گنگناتی واپس سیڑھیوں سے نیچے اتر رہی تھی، لیکن ہال میں سارہ اور جمال اس کے انتظار میں تھے۔

میں تمہیں بتا نہیں سکی ونسیمنٹ

کہ یہ دنیا تم جیسے خوبصورت انسان کے لیے نہیں تھی۔ وہ گنگناتی ہوئی آگے بڑھی۔
”میں لوگوں کو اپنے فن سے چھوٹا چاہتا ہوں میں چاہتا ہوں وہ کہیں یہ گہرائی میں محسوس کرتا ہے

۔“

اور تب اس کی موت کے بعد روڈن اس کے ایک قریبی ساتھی نے کہا وہ بہت گہرائی میں محسوس کرتا ہے۔ کیا ایک دل کو چھو لینا سب کا دل چھو لینا ہوتا ہے؟ کیا اس کی ایک پینٹنگ جو بچی اس میں ساری انسانیت کی طرف سے خراج تھا؟ کیا اس کو خبر تھی کہ اس کے خواب ادھورے نہیں رہیں گے کسی دن پورے ہوں گے؟ وہ کیا کہے اگر وین گاف میوزیم میں رب اس کے آنے کی منظوری دے دے اور وہ لوگوں کو اپنی پینٹنگز میں یوں کھویا ہوا پائے؟

واپس آکر بھی وہ ان پینٹنگز کے ٹرانس میں تھی وہ کون سے ہاتھ تھے جنہوں نے یہ عکس کیا تھا۔ ان ہاتھوں نے اسے ونسیمنٹ کی یاد دلوا دی تھی جس کا پورٹریٹ اس کے بیڈ کی پچھلی دیوار پر لگا تھا۔ کوئی سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا کہ تخلیق کرنے والوں کا دماغ کبھی بھی ساتھ رہتے لوگوں کی دماغ کی فریکوینسی سے میچ نہیں کر پاتا۔۔۔ وہ چاہ کر بھی ان کے ساتھ قدم ملا نہیں پاتے۔ اور یہ تخلیق کار صرف ایک لکھاری، مصور یا شاعر نہیں ان میں کوئی بھی ہو سکتا ہے جو اپنی تخلیقات کو معراج پر قدرت کے حکم سے لیکر جا رہا ہوتا ہے جسے کسی بھی قسم کا کوئی اثاثہ چھوڑ کر جانا ہوتا ہے اس میں کوئی باورچی، سافٹ ویئر انجینئر، بزنس مین کوئی بھی ہو سکتا ہے جو اپنی فیلڈ میں تخلیق کر رہا ہے، تحقیق کر رہا ہے اور یہ سب کتنا

تکلیف دہ ہوتا ہے۔۔۔ دونوں طرح کے لوگوں کے لیے مگر یہ یونہی طے ہے جو تخلیق ہونا ہے وہ قربانی اور آنسوؤں سے ہی تخلیق ہونا ہے۔ سم سم کے بال کی طرح بلندیوں اور پستیوں میں ٹھپے کھاتے تخلیق ہونا ہے۔ ایک عظیم تخلیق کار کون ہوتا ہے صرف وہی جس کا سر آسمان کی طرف نہیں اٹھا ہوتا بلکہ قدم کیچڑ میں لت پت ہوتے ہیں۔ پسائیاں دیکھے بغیر کیا کوئی عظیم تخلیق وجود میں آسکتی ہے؟ جس کو شفاف ہوا کا حُسن دیوانہ کرتا ہے مگر جس نے سیاہ دھواں نہیں چکھا، اس میں سانس لیتا کوئی حسین چہرہ بگڑتے نہیں دیکھا کیا وہ فضا کے بارے میں لکھ سکتا ہے؟

یہ صرف و نسیڈنٹ سے اس کی محبت کا معاملہ نہیں تھا وہ جانتی تھی ماضی میں تخلیق کاروں نے کیسی زندگیاں گزاری ہیں، زیادہ تر کیوں خود کشی کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اسے صادقین کے ان ہاتھوں سے عشق تھا جن کو پینٹ نہ کرنے پر تکلیف محسوس ہوتی تھی، اسے نیوٹن کی تنہا زندگی سے عشق تھا، اسے جیک لنڈن کے کوڑا اٹھاتے ہاتھوں سے عشق تھا، پروین شاکر کے ننگے پاؤں سے عشق تھا اسے ہر تخلیق کار کی زندگی سے عشق تھا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ فن پاروں کے پیچھے تکلیف کا کتنا گہرا زخم زخم سمندر موجود ہے۔



ڈرائیور اسے جمال اور سارا کی طرف چھوڑ کر گیا تھا، یہ کئی کنالوں پر پھیلا شہر سے باہر ایک قطعہ تھا جہاں ان کا گھر تھا۔ جمال کے والدین کا کار ایکسیڈینٹ میں انتقال ہوا تھا سو اسے اس کے چچا نے گود لے لیا تھا اس وقت اس کی عمر چھ برس تھی۔ کمبائن سٹڈیز جیسا کہ ظاہر ہے جس میں پڑھائی کے علاوہ ہر چیز کی جاسکتی ہے کھانا، پینا، پارٹی اور مستقبل کے منصوبے ان کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوتا تھا۔ سارا کی شخصیت عجب امتزاج کی تھی اسے آوارہ گردی کرنے کا جنون کی حد تک شوق تھا اور یہ شوق وہ اپنے بہن بھائیوں اور جمال کے ساتھ خوب پورا کرتی تھی، انگریزی فلمیں دیکھتی تھی، انگریزی گانے سنتی تھی، پنک فلوئڈ

اس کا پسندیدہ بینڈ تھا جس کے سارے گانے اس کو ازبر تھے۔ انگریزی میں شاعری کرتی تھی جو اکثر ڈان میں چھپتی رہتی تھی۔ ایک پاپ سنگر سے اس کی سائنگز لکھنے پر بات چل رہی تھی۔ موٹر سائیکل شاید لڑکے بھی اس سے بہتر نہیں چلا سکتے تھے، کالے سیاہ کرلی بال، سیاہ آنکھیں سانولا چہرہ عجیب کشش کے ساتھ اپنی اور کھینچتا تھا۔ جمال بھی اتنا ہی آوارہ گرد اور سارہ کے مزاج کا تھا تبھی بہن بھائیوں سے زیادہ دونوں کی آپس میں بنتی تھی اب سارا میں جسے جمال سارا ٹو بھی کہتا تھا انہیں کیا نظر آیا تھا اپنے جیسا کہ پہلے دن سے اب تک ان کی دوستی بڑھتی گئی تھی اس کی خبر تینوں کو نہیں تھی۔ شاید روحیں بھی ایک دوسرے کا عکس ہوا کرتی ہیں۔

”کیا یہ میرے آرٹھ جتنے بہترین دوست بن چکے ہیں۔“

روز اینڈ جمیسن گارڈن میں پھرتے، شکر پڑیاں میں کسی غریب گلوکار کا گانا یا بانسری سنتے، سعید بک بینک میں کتابوں کے شیلوز کے درمیان ان کے ساتھ پھرتے کتابیں ڈھونڈتے، موناں میں کافی پیتے، سڑک پر موٹر سائیکل اچانک خراب ہو جائے تو وہیں سامنے کسی گھاس کے قطعے کے حاشیے پر بیٹھ کر زن سے گاڑیوں کو وہاں سے گزرتے دیکھتے، سارہ کو موٹر سائیکل پر مضبوطی سے پکڑتے، جمال کو جان بوجھ کر ان سے شرطیں ہارتے دیکھ کر وہ سوچتی تھی۔

”اور یہ کیا محسوس کریں گے اگر میں ان کو آرٹھ کے بارے میں بتاؤں کیا یہ یقین کریں

گے۔۔۔“



گھر داخل ہوئی تو اماں ملنے آئی ہوئی تھیں وہ یونہی اچانک بن بتائے آیا کرتی تھیں، وہ ان سے لپٹ گئی۔

”میں کچھ دن آپ کے ساتھ آنا چاہتی ہوں چھٹیاں ہو رہی ہیں۔“

”تو ہاں میں خود اسی لیے آئی ہوں۔“ وہ ڈائینگ ٹیبل پر سے ڈش اٹھا کر چاول نکالتے ہوئے بولیں۔

”کھانا کھاؤ۔“

”نہیں فل ہوں۔“

”جمال اور سارا کیسے ہیں؟“

”ٹھیک ہیں۔۔۔ ابھی چھٹیوں میں کیپڈو کیا جا رہے ہیں۔“ وہ سامنے کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔
 ”ہنہ۔“ سارا کی طرف سے انہیں اطمینان ہوا تھا چہرے کی پڑمردگی دور ہو رہی تھی۔



بی ایس سی آنرز میں اس کے مضامین فزکس، میتھ اور کیمسٹری تھے جبکہ میجر سبجیکٹ کیمسٹری تھا۔ وہ میتھ پر آکر بری طرح پھنسی تھی پڑھائی میں گیپ آجانے کی وجہ سے اب مشکل ہو رہی تھی۔ آج وہ الخوارزمی کے بارے میں پڑھنے بیٹھی تھی کہ آرشی آدھمکا۔

”کچھ فائدہ نہیں ہو رہا کمبائن سٹڈیز کا۔“ اس نے منہ بسورا۔

”اس کو کمبائن پارٹی کہا کر ونا۔“

”ہہ۔“

”وہ دونوں بہت اچھے ہیں۔“

”میں خوش ہوں تمہارے لیے۔“

”چلو گی؟“

”کہاں؟“

”ان سے ملنے۔“

یہ پہلا موقع تھا جس میں وہ وقت کی اس ڈائسمینشن میں اپنی آواز دوسرے انسان تک پہنچا سکتی تھی۔ یہ بات آرٹھ نے اسے وہاں پہنچ کر بتائی تھی۔

وہ کہاں تھی الف لیلیٰ کی داستان کے شہر میں، خلیفہ مامون کی سلطنت میں جہاں شہر زاد اسے ہر رات ایک کہانی سنایا کرتی ایک ہزار کہانیاں الف لیلیٰ، دریائے فرات کے کنارے آباد اس شہر میں۔ اس نے وہاں بڑے بڑے بازار دیکھے جہاں غلاموں کی، ریشم اور سونے کی مصالحوں کی تجارت ہو رہی تھی۔ اس نے بیت الحکمت کی سنہری جادوئی عمارت دیکھی۔ وہاں شاعری، حکمت، سائنس، موسیقی، رقص، جادوگری، کرتب گری اور بازی گری ہر طرح کا فن معراج پر تھا۔ ہر ایک کو یکساں پزیرائی حاصل تھی۔

وہیں وہ اس قدیم دنیا میں مشعل کی روشنی میں ہلکا سنہرا سادہ مکتے عود کی خوشبو سے مہکتے کمرے میں داخل ہونے سے جھجک گئی تھی جہاں سامنے میز پر لکڑی کا تختہ، کاغذوں کے بندل دوات کی بوتلیں اور قلم، قلم تراشنے والے بلیڈ پڑے تھے۔ اتنے میں اس کے سامنے رعب دار پر تمکنت شخصیت ظاہر ہوئی۔ الخوارزمی سر پر کیسری گترا، سرمئی لباس۔ وہ پلکیں نہیں جھپک سکی۔

انہوں نے اسے قہوہ پیش کیا سارا کی آنکھیں چمک اٹھیں تھیں یکدم اسے سکون سا آگیا تھا گھبراہٹ غائب ہو گئی وہ نشست میں ان کے پاس جا بیٹھی۔

”کیا کرتی ہو؟“

”میں طالب علم ہوں۔“ وہ مسکرائے۔

”ریاضی کی؟“

”جی۔“

”ابھی تمہارے آنے سے پہلے میں ایک گتھی سلجھا رہا تھا کہ اگر تین گھر وراثت کے طور پر پانچ

بچوں میں تقسیم کرنا ہیں تو کیا مساوات بنائی جائے۔“ وہ نم سا مسکرائی۔

”تو اسی لیے آپ نے الجبرا متعارف کروایا ہے۔“

”میری کتاب الجبرا والمقابلہ اسی بارے میں ہے۔“

سارا کی زبان پھر سے گنگ ہونے لگی تھی کہ وہ کس سے بات کر رہی ہے۔

”تو تم کہہ سکتی ہو کہ تم لوگوں کو مدرسوں میں جو الجبرا جو سیکھنا پڑتا ہے وہ میری وجہ سے ہے لیکن

مجھے قصور وار مت ٹھہراؤ تمہیں اس کی ضرورت ہے سو اس سے ہم بہت سی مساوات حل کر سکتے ہیں اور

ہم بہت سے اعداد حاصل کر سکتے ہیں۔ خلیفہ مامون نے مجھے بیت الحکمت میں یہی کام کرنے کا کہا ہے۔“

”بیت الحکمت میں اور کیا کیا ہوتا ہے۔“ سارا نے اشتیاق سے پوچھا تھا۔

”میرے بہت سے ساتھی قدیم یونانی اور لاطینی، سنسکرت اور فارسی متن کو عربی میں ترجمہ

کرتے ہیں تاکہ دنیا کو بہت سے قدیم علما کے بارے میں پتا چل سکے لیکن میری دنیا اعداد کی ہے۔“

”اعداد کی۔“ سارا کے ہونٹ بے آواز ہلے۔

”مجھے اعداد سے عشق ہے۔۔۔ کیسے وہ ایک دوسرے کے ساتھ رقص کرتے اور کھیلتے ہیں۔“ ان

کی آنکھوں میں اعداد کے بارے میں بات کرتے ہوئے الوہی چمک در آئی تھی۔ ”ابھی زیادہ عرصہ نہیں

ہوا میں نے بہت سے ہندی اعداد کو یہاں متعارف کروایا ہے۔“

”ہندی اعداد۔۔۔ ہاں تمہارے دیس سے۔“

”تم جو بغیر احساس کیے صفر کا استعمال کرتی ہو یہ خالص ہندی عدد ہے۔ اس سے پہلے ریاضی کی

دنیا میں یہ موجود نہیں تھا میں نے اس عدد کو اپنی دنیا میں متعارف کروانے میں مدد دی ہے۔“

”ہاں صفر کے بارے میں کیا کہوں۔۔۔ صفر ایک کامل عدد ہے سو میں نے اسے دائرے کی

صورت دی۔“ وہ صفر کے بارے میں بتاتے ہوئے ایک عجیب سی کیفیت کا شکار نظر آئے۔

”یہ الجبرا میں ہر چیز کی شروعات ہے اور لاطینی زبان میں میرے نام کا ترجمہ ہے۔ میں نے وہ عدد تمہیں دیا ہے جو تمہاری دنیا چلاتا ہے الگور تھم۔ یہی اعداد جب مل کر کام کرتے ہیں تو تمہاری ڈیجیٹل دنیا چلتی ہے۔ ہندسے، انگلیاں، اعداد۔۔۔ اس طرح تم نئے رخ سے سوچتے ہو اور انہیں حقیقت بناتے ہو اسی لیے وہ مجھے جدید ریاضی کا بانی کہتے ہیں۔“

سارا کو وہاں بیٹھے وقت گزرنے کا احساس نہیں ہوا تھا جب وہ آرٹھ کے ساتھ باہر نکلی وہ اتنا خوش تھی کہ اسے فضا میں اپنی مسکراہٹ کی ہلکی سی دمک نظر آتی تھی۔ آج سے پہلے اس نے کبھی اتنی خوشی محسوس نہیں کی تھی۔

”حقیقی خوشی دنیا کی سب سے پرکشش چیز ہے۔“ آرٹھ نے اس کو دیکھتے ہوئے سوچا تھا۔
 ”پتا ہے جمال اور سارا کیپیڈو کیا جا رہے ہیں۔“ وہ دریائے فرات کے کنارے اس کے ساتھ چلتے ہوئے بولی تھی۔

”تم بھی جانا چاہتی ہو۔“ بھلا آرٹھ سے کیسے کچھ چھپایا جاسکتا تھا وہ تو جن تھا۔
 ”ہاں پر اماں نہیں مانیں گی۔ انہوں نے تو کبھی مجھے سکول ٹرپ پر نہیں جانے دیا۔“
 ”مجھے لگتا ہے اس بار مان جائیں گی۔“
 ”وہ کیسے؟“

”کیونکہ وہ تمہارے بارے میں آج کل الگ انداز سے سوچنے لگی ہیں، میں تو وہیں ہوتا ہوں۔“
 ”پھر میں پوچھنے کی غلطی کر لوں۔“
 ”ہاں کر لو۔“ وہ ہنسا۔

”سیاحت بھی عجیب چیز ہے نا اور سیاح عجیب تر۔ ساراہ اور جمال وہ اس لیے دنیا سے مختلف لگتے ہیں مختلف سوچتے ہیں ہر شے، ہر نظریے، زندگی کے ہر رنگ کو قبول کرتے ہیں کیونکہ وہ جہاں گرد

ہیں۔ یہ زمین پر گردش، خون میں گردش کی طرح زندگی کی حرارت پیدا کرتی ہے۔“

”ہاں اور کچھ سیاح رو حیں بھی ہوتی ہیں جیسا کہ تمہاری۔“

اگر آپ بھی فرات کے پانیوں کو اندھیرے میں محسوس کر سکتے ہیں اور وہاں پر بیٹھے ان دونوں کو دیکھتے ہیں تو وہ باتیں کرتے چلتے چلے جا رہے تھے ان کی آوازیں معدوم ہوتی جا رہی تھیں۔

اور جوان کو سامنے سے اپنی طرف آتا دیکھے تو دیکھے گا کہ سارا یکدم چونک کر رکی تھی۔

”یہ ہم کہاں ہیں؟“ اس کے سامنے تیکھے، تیز نین نقش کا حامل شخص کھڑا تھا۔ وہ اپنے وقت کا

عالم تھا اور اس وقت آسمان پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔

”یہ کون ہیں؟“

یہ ابن بطوطہ ہیں اور تم اس وقت مراکش میں ہو۔“

”خوش آمدید سیاحوں کی دنیا میں کہ ان کی ارواح صرف دنیا میں نہیں یہاں بھی سیاحت سے باز

نہیں آتیں۔“ ابن بطوطہ نے اسے اپنے ہاتھ سے لکھا طویل سفر ناموں کا مجموعہ دکھایا۔ سارا نے انہیں بتایا کہ وہ بچپن میں ان کے سفر کے قصے پڑھتی رہی ہے۔ وہ مسکرا دیے۔

اس کے بعد وہ ابن حوقل سے ملی تھی جن کی مشہور کتاب ”زمین کا چہرہ“ کے بارے میں اس

نے سن رکھا تھا جس میں انہوں نے خط استوا کے جنوب کی طرف رہائش پذیر لوگوں کے بارے میں لکھا تھا۔

اس کے بعد اس کی ملاقات ابن ماجہ سے ہوئی جنہوں نے پندرہویں صدی میں ہوا، موسم، سمت

شناسی اور ساحل کے پانیوں میں کیسے چلنا ہے اور کھلے سمندر میں کیسے ان سب میں لوگوں کی رہنمائی

کی۔ انہوں نے خلیجی ملاحوں کو مشرقی افریقہ کے بندرگاہ بھارت اور مشرقی ایشیا تک پہنچانے میں بھی مدد

دی۔

پھر وہ شمس الدین الدمشقی سے ملی جو کہ اپنے وقت کے مشہور جغرافیہ دان تھے انہوں نے اپنے آبائی ملک شام کے متعلق ہی زیادہ تر لکھا۔ زہنگ ہی جن کا تعلق مسلمان خاندان سے تھا چینی سیاح تھے شمال مشرقی ایشیا، جنوبی ایشیا، مغربی ایشیا اور مشرقی افریقہ تک انہوں نے سفر کیا۔ یہ کیسی عجب دنیا ہے یہ لوگ ستاروں سے رستہ پوچھا کرتے تھے، آوازیں اور روشنیاں اندرونی دنیا ان کی رہنما تھیں۔ انہوں نے خود نقشے مرتب کیے، سیاحت کو فروغ دیا۔

آرٹھ نے اسے پیری رئیس نقشہ دکھایا۔

”یہ دنیا کا سب سے قدیم نقشہ ہے۔ جس میں امریکہ اور افریقہ کو دکھایا گیا ہے۔“ پھر آرٹھ نے اسے ایک اور نقشہ دکھایا جسے دیکھ کر وہ لرز کر رہ گئی تھی۔

۱۱۵۴ء میں بنایا گیا نقشہ جس میں یوریشین براعظم دکھایا گیا تھا۔ یہ اپنے وقتوں کا سب سے درست نقشہ تھا جو قریباً ۳۰۰ سال استعمال ہوا۔ جس بات نے اسے دہلایا وہ یہ تھی کہ اس نقشے میں یاجوج ماجوج کے علاقے کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔

یاجوج ماجوج کا علاقہ قدیم نقشے میں بلخاریہ اور ترکش علاقے کے قریب دکھایا گیا تھا۔

”زیادہ حیران ہونے کی ضرورت نہیں ہے بچے یاجوج ماجوج کوئی ماورائی مخلوق نہیں تھی انسان تھے تمہاری اور میری طرح۔“ اس کا منہ کھل گیا تھا پھر اس نے منہ بنایا تھا۔

”یاجوج ماجوج نوحؑ کے بیٹھے یافثؑ کی اولاد میں سے تھے، یافثؑ بہت علم والے انسان تھے ان کی اولاد نے مرکزی ایشیا عبور کیا اور شمال میں چلے گئے اور وہاں دائیں بائیں پھیل گئے۔ صحرائے گوبی، چین، روس، مغربی یورپ اور خاص کر مشرقی یورپ کا شمالی علاقہ سب یافثؑ کی نسل میں سے ہیں۔ تو رات میں ان کے کئی بیٹوں کے نام آئے ہیں جن میں یاجوج ماجوج کے نام بھی ہیں اور ماسک بھی اور ممکن ہے کہ روس کا شہر ماسکو انہوں نے ہی بسایا ہو۔“

”ہنہ۔“ وہ اتنی معلومات پر اب محض سر ہی ہلا سکتی تھی۔



وہ دو سینگ والا تاج پہنے شہنشاہ خسرو لقب ذولقرنین گھوڑے کی باگیں تھامے سفر میں تھا۔ اس کے لشکر اس کے پیچھے اسی رفتار سے اس کے ساتھ دوڑتے تھے۔ منظر آدھا دھول میں گم تھا۔ ذولقرنین کے سنگ آرٹھ کی آواز کے ہمراہ وہ بھی سفر میں تھی کہ یکدم تھی تھی کیونکہ ذولقرنین نے گھوڑے کی لگام کھینچی تھی۔ وہاں سورج سیاہی مائل ہوتے بجیرہ روم میں ڈوب رہا تھا۔ وہ اس دو سینگ والے صالح شہنشاہ کے سنگ کھڑی اس منظر کو دیکھتی تھی پھر وہ پلٹا اور فتوحات کرتا ہوا ایک ایسی جگہ پہنچا جہاں سورج آگ رہا تھا۔ یہ ایسی جگہ تھی جہاں لوگوں پر کوئی چھاؤں کا سامان نہ تھا۔ یہ وحشی قبائل تھے چھت بنانے کا فن نہیں جانتے تھے بس دیواریں کھڑی کیا کرتے پھر وہ شمال کی جانب آیا بحر کیسیپیئن اور بحر اسود کے درمیان پہاڑی سلسلے تک۔ وہاں بستے لوگ اس کی زبان نہ سمجھتے تھے۔۔۔ پھر انہوں نے اسے بتایا کہ یاجوج ماجوج نے ان کی زندگی اجیرن کر رکھی ہے ♥۔ وہ لوگ شمالی دروں سے آکر ان پر حملہ کرتے تھے۔

انہوں نے ذولقرنین کو خراج کی پیشکش کی مگر اس نے انکار کر دیا۔ اس نے صرف قوت بازو مانگی اور لوہے کے تختے لانے کو کہا۔ اس نے ان کے لیے ان کے ساتھ مل کر ڈیم کی طرز پر اس پہاڑی سلسلے کے درمیان داریال پاس پر لوہے کی دیوار تعمیر کی پھر اس لوہے کی دیوار کے نیچے آگ بھڑکا دی گئی، لوہا تپ کر سرخ ہونے لگا تو وہ اس پر گھلتا تا بنا ڈالتے جاتے تھے۔ وہ ان کو وہ دیوار تعمیر کرتے دیکھتی تھی۔ یہ داریال اور دربند کا کشادہ علاقہ تھا بحر کیسیپیئن کے شمالی ساحل کے ساتھ، اس دیوار کی اونچائی ۲۹ فٹ اور چوڑائی دس فٹ تھی۔

”اب نہ تو وہ لوگ اس دیوار کے اوپر سے چڑھ کر آسکیں گے اور نہ اس میں سوراخ کر سکیں گے،

اللہ کا اذن جب تک ہو گا یہ دیوار تب تک قائم رہے گی۔“



”یہ پانچ سو ستاسی قبل مسیح کی بات ہے یعنی میرے پیدا ہونے سے کوئی اسی سال پہلے کی، اس دور میں عراق کے بادشاہ نبوکدنذر نے یروشلم پر قبضہ کر لیا تھا بنی اسرائیل کی بڑی تعداد ایک سو پچاس برس کے لیے قیدی ہو گئی تھی۔ اسی عرصے میں ایران میں یہ شخصیت ابھری جس کا ذکر قرآن کی زینت بنا۔“ آرٹھ اس کے ساتھ بحر اسود کے ساحل پر چلتے اسے بتا رہا تھا۔

”خسرو ایک چھوٹی سی مملکت کا شہزادہ تھا۔۔۔ ممکنہ قتل سے بچنے کے لیے اس نے صحرا میں پناہ لی۔ کہتے ہیں وہاں وہ کسی نبی کی تعلیم سے فیض یاب ہوا ممکن ہے وہ نبی زرتشت ہوں۔ وہ ایک بہادر، جنگجو، صالح مرد مومن تھا۔ اس نے عراق یعنی بابل پر قبضہ کیا اور یہود کو اجازت دی کہ یروشلم میں ہیکل سلیمانی دوبارہ تعمیر کریں۔ خسرو کے دور سے ہی ایران کے عروج کا آغاز ہوتا ہے اس نے ایران کے دو ٹکڑوں قدیم فارس اور ماد کو فتح کر کے جوڑا اور اسی کی نشانی کے طور پر دو سینگ والا تاج سر پر سجایا اور ذوالقرنین کہلایا۔

شہنشاہ ایران نے ایران کے عروج کے دور میں ذوالقرنین کا ڈھائی ہزار سالہ جشن منایا۔ تب تک اس کا مقبرہ بھی دریافت ہو چکا تھا اور دو سینگ کا تاج پہنے مجسمہ بھی۔“

”میرے لیے حیرت کی بات یہ بھی ہے وہ لوگ بنا اس کی زبان جانے اس کو اپنی بات سمجھا لیتے ہیں۔“

”زبانیں شعائر اللہ ہیں اور سب زبانوں کی مرشد محبت کی زبان ہے، انسانیت کی زبان۔۔۔ جسے لفظوں کی حاجت نہیں ہے، ہمدردی کی زبان، ایثار کی زبان، خیر خواہی کی زبان۔۔۔“

”کیا انسان کو انسان کے حصے کا حُب اس تک لوٹانے کے لیے زبان یا لفظ کی ضرورت ہے؟“

”ہاں یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے البیرونی۔۔۔ جو ہند میں پہاڑ پر چڑھ کر پوری دھرتی کا قطر ناپ لے۔“ سارا ابھی کہہ ہی رہی تھی کہ یہ کیا اس نے البیرونی کو وہاں اپنے قریب پہاڑ پر کھڑے دیکھا۔

”آرٹھ میں تھک گئی ہوں۔“

”یعنی کہ تم البیرونی سے نہیں ملنا چاہتی؟“ آرٹھ کی آنکھیں یکدم بڑی ہوئی تھیں۔ وہ سہم گئی کبھی کبھی بڑی آنکھیں کرنے والوں سے ڈر بھی جایا کرتی تھی۔

”حد ہو گئی۔۔۔ نہیں میں ملنا چاہتی ہوں۔۔۔“ اس نے حیرانی سے سوچا وہ یہ کیا کرنے جا رہی تھی۔

”بعض اوقات نعمت مسلسل ملتی رہے تو زحمت لگنے لگتی ہے۔۔۔ یہ غلط ہے۔“ وہ دھیرے دھیرے چلتی ان تک چلی گئی اور اس مشفق سے چہرے کو دیکھنے لگی۔

وہ اس کے تعارف دینے پر مسکرائے تھے۔

”کوئی ایک خاص چیز مت پوچھنا میں وہ انسان ہوں جسے ہر چیز میں دلچسپی ہے۔۔۔ پتھر، معدنیات، تاریخ، دوائیاں۔۔۔ سب میں میری ایک سی دلچسپی ہے۔ اسی وجہ سے مجھے پہلا ماہر انسانیات کہا جاتا ہے۔۔۔“

”نائس ٹائٹل۔“ اس نے دل میں سوچا۔

”مجھے لگتا ہے انسان کو حقیقت پسند ہونا چاہیے اور با مقصد اور سائنس میں اسے لازمی دلچسپی ہونی چاہیے۔“ انہوں نے سر پر جما عمامہ درست کرتے ہوئے سارا کو ایک روشنی کا ذرہ تھماتے ہوئے کہا

حالانکہ اس نے وہ ذرہ ان سے مانگا نہیں تھا۔

”میں اپنے وقت کے بڑے بڑے علما کے ساتھ رابطے میں رہتا ہوں خاص کر طب کے جینیٹس ابن سینا اور ماہر فلکیات ابو وفا کے ساتھ۔ ابھی حال ہی میں ابو وفا نے اور میں نے مل کر سورج گرہن کا

اکٹھے مشاہدہ کیا ہے۔۔۔ انہوں نے بغداد میں اور میں نے ازبکستان میں پھر ہم نے وقت اور دوسری معلومات ایک دوسرے کو فراہم کیں۔ میں نے علم مثلث استعمال کر کے جس میں مجھے خاص مہارت حاصل ہے شہروں کے درمیان فاصلوں پر کام کیا۔۔۔ مشرق سے مغرب تک طول بلد ماپا۔ علم ہی ہمیں انسان کے درجے پر فائز کرتا ہے یقین مانو۔“ ایک اور ذرہ تھما دیا تھا۔

”میں نے قانون السعودی میں ستاروں اور سیاروں کی حرکت ماپنے کے طریقے بتائے ہیں۔“

”میں نے اس کتاب کے بارے میں پڑھ رکھا ہے۔“ سارا ان کی مہربان اور ذہین آنکھوں کے عکس کو دل کے ورق پر ثبت کرتے ہوئے بولی تھی۔

”یہ کتاب میں نے محمود غزنوی کے بیٹے مسعود کے نام وقف کی سوان کے نام پر اس کتاب کا نام رکھا۔۔۔ یہ کتاب علم فلکیات، جغرافیہ اور انجینئرنگ کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ لائسنسز اور نیوٹن نے اس میں سے میرا طریقہ استعمال کر کے کیلکولس کا طریقہ دریافت کیا۔“

”واو۔“ سارا بے اختیار بولی تھی وہ متاثر ہو رہی تھی اور انہیں سننے رہنا چاہتی تھی۔

”اور آپ نے اس دور میں پوری زمین کا قطر کیسے ناپ لیا میرے نزدیک اس سے بڑی کامیابی اور نہیں ہو سکتی ہے۔“

”میں نے اپنے خادم سلطان کے ساتھ یہاں یعنی ہند کی طرف کا سفر کیا میں یہاں لوگوں اور تاریخ کے بارے میں لکھ ہی رہا تھا کہ اچانک مجھ پر کشف ہوا کہ زمین کا قطر کیسے ناپا جائے۔ جس کے لیے بس ایک پہاڑ درکار ہے، پہاڑ پر چڑھنے والے اچھے سے جوتے، ایک چھوٹا پتھر، ایک بورڈ اور اسطرلاب، علم مثلث اور جیومیٹری پر مہارت۔۔۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولے تھے۔ سارا بھی مسکرا دی۔

”اسی طریقے کے ذریعے میں نے یہ نمبر حاصل کیا ۱۲۸۰۳۳۳ کیوبٹ، سب مجھے کہتے ہیں یہ ایک بڑی کامیابی ہے کیونکہ یہ اصل نمبر سے ہلکا سا ہی آگے پیچھے ہے۔“

”بالکل۔“ وہ مسکرا دی۔

”میرا آپ سے مل لینا ایسا ہے جیسا آپ کا اس پہاڑ پر چڑھ کر پوری دھرتی کا قطر ناپ لینا۔“
”اور محبت کی زبان کیسی ہے؟“

”ایسی جیسے مریم کا ہاتھ سے بنایا اسطرلاب ستاروں کی سمت بتائے۔“ آرٹھ بولا تھا۔
”ہاں بالکل۔“

”وہ شام کے قلعے میں کام کرنے والی ایک حسینہ، وہ اپنے وقت کے بہترین لوگ، موہ رکھنے والے۔“

”اور اسطرلاب ان کے زمانے کا کمپیوٹر، ایک بہترین گیجٹ جو ستاروں کے راز بنا بولے بتاتا تھا۔۔۔ جو بتاتا تھا وہ بالکل ٹھیک ہوتا تھا کہ تم زمین پر کہاں ہو اور باقی ساری چیزیں کس سمت میں ہیں۔۔۔ تم یہاں ہو اور وہ کہاں ہے جہاں تم جانا چاہتے ہو اس سمت میں جاؤ۔“
”اور مریم یہ مشینیں سیف الدولہ کے لیے بناتی تھی۔“

”آسمان پر ستارے کی جگہ زمین پر تمہاری جگہ کے مطابق ہوتی ہے۔“ آرٹھ نے کہا تھا۔
”ہاں آسمان پر جگہ زمین پر ہمارے قدم کہاں ہیں اسی پر زبھر ہے۔“ وہ اس کی بات دہرا رہی تھی۔

”جانتی ہو اسطرلاب یونانیوں نے بنایا تھا۔۔۔ مسلمانوں نے اسے کامل کر دیا۔ ان کے لیے ضروری تھا کہ وہ جانیں کہ وہ کس وقت کہاں موجود ہیں، مکہ کی سمت کس طرف ہے، طلوع و غروب شمس کے اوقات کیا ہیں۔۔۔ اس کی پلیٹیں گھومتی تھیں اور وہ آسمان پر ستارے دیکھتے تھے پھر وقت، تاریخ اور جگہ کا تعین کیا جاتا تھا۔“

”یہ ایسے ہی جیسے آج سیٹلائٹ۔۔۔“

”ہاں بس یہ سو فیصد درست نہیں تھا۔“

”اور کیسے ہوتا ہے محبت کا اظہار۔۔۔“ سارا اثرات سے بولی تھی
”جیسے کوئی لیلیٰ سی خلا میں آئی ایس ایس (انٹرنیشنل سپیس سٹیشن)

میں کسی کونے میں ٹک کے تخیل میں گٹار بجائے، کتاب پڑھنے کی کوشش کرے، ڈبوں میں
کھائے پیے، پودے اگائے، دھرتی کو دیکھے ڈپریشن میں آنسو بہائے، مجنوں ہو جائے۔“

”یہ لیلیٰ مجنوں تو عرب سے تعلق رکھتے تھے تم مجھے ایران کیوں لے گئے تھے ان سے ملوانے؟“

”وقت اور کہانیاں ایک جگہ پر قائم ہیں سارا اور ہم اس میں سے گزر رہے ہیں
۔۔۔ کہانیاں۔۔۔ محبت کی، ظلم کی، وفا کی، جفا کی، گناہ کی، ثواب کی۔۔۔ وقت کی طرح کہانیاں بھی
ٹھہری ہوئی ہیں اور انسان ان میں سے گزرتے ہیں اسی لیے لیلیٰ مجنوں کوئی بھی ہو سکتے ہیں کہیں سے بھی
ہو سکتے ہیں۔“

پہلی دفعہ اسے نظامی نے شاعری میں قلم بند کیا وہ ایرانی شاعر تھا لیلیٰ کو اٹھا کر ایران لے گیا
کیونکہ وہاں بھی لیلیٰ کی کہانی موجود تھی مگر سنی نہیں گئی تھی۔

اسی طرح یاجوج ماجوج ہیں وہ نکلے تو دیوار تعمیر ہوئی وہ قرب قیامت آخری بار نکلیں گے اور
آخری فتنہ پھیلائیں گے یہ وہی لوگ ہیں جو ہر چیز کھا جاتے ہیں جن کے علاقے پہاڑوں سے گھرے ہیں اور
اس پر سے یہ ایسے اتریں گے جیسے لہریں۔“



تین لاکھ سال پہلے تین آتش فشاں پہاڑوں سے لاوا بہتا تھا اور سب تہس نہس کرنا آگے بڑھتا
تھا۔ آسمان پر دور تک تپش جاتی تھی، ہر چیز پگھلی ہوئی تھی کسی بھی قسم کی شکل لینے کو تیار۔ اس کی راکھ
اور مٹی نے زمین پر عجیب طریقے سے ٹھنڈا ہونا شروع کیا۔ ہوائیں، بارشیں اس زمین کی عشقیہ

ساخت کو وجود میں لانے کے لیے اپنا حصہ ڈالتی تھیں اور وقت کا پیر سیاہ لبادے میں کائنات کے کناروں تک پھیلا کہتا تھا یہاں اب چاند جیسی زمین وجود میں آئے گی، دور ایک برف سے ڈھکا پہاڑ چھب دکھلائے گا۔ یہاں کی گلیوں میں سارا جوتے اتار کر پھرے گی اور جمال اسے اپنی کہانی سنائے گا۔۔۔ وہاں بہتے لاوے کے نیچے ان کے قدموں کے نشان دہکتے تھے ان کی آوازیں وہاں تین لاکھ سال پہلے گردش کرتی تھیں۔



”اب چونکہ تمہیں اجازت مل گئی ہے ہمارے ساتھ چلنے کی تو تھوڑی جانے کی تیاری بھی کر لینا۔“

”حکم کریں۔“ سارا نے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

”وہاں آج کل منفی آٹھ تک درجہ حرارت ہو گا تو اس حساب سے تیاری کرنی ہے۔“

”واہ۔۔۔ اوکے۔“ سارا کو جھر جھری آئی تھی وہ ابھی یہاں نومبر میں ہی کانپ رہی تھی منفی آٹھ کا سن کر تھوڑا پریشان ہوئی تھی۔ وہ لوگ اس وقت شکر پڑیاں کے باہر سیسپیڈوں سے بنی چیزیں دیکھنے میں مصروف تھیں شام کو اماں کے ساتھ واپس گھر جا رہی تھی۔



”نتھیا گلی ویران ویران سی کیوں ہے حالانکہ سب پہلے جیسا تو ہے۔“ اماں اس بار اس کے نہ بولنے پر ٹوکتی نہیں تھی بلکہ خود ہی بولتی جاتی تھیں تاکہ وہ جواب میں کچھ تو بولے گی۔ وہ سوچتی ماؤں کا پیار کیسا ہوتا ہے وہ صرف دیتی ہیں دیتی چلی جاتی ہیں اور بدلے میں انہیں صرف اولاد کی خوشی چاہیے بس۔ یہ محبت میں بے خودی رب نے ودیعت کی ہے ورنہ بچے شاید دنیا میں سردائیوں نہ کر پائیں۔ اگر ارام موسیٰ کے دل پر گرہ نہ لگائی ہوتی تو وہ کبھی انہیں دریا میں ڈال نہ پاتیں۔ اور آج بھی تو کتنی مائیں اولاد کو بچانے کی

خاطر دریاؤں میں ڈال دیتی ہیں۔

انہوں نے اسے اتنی شاپنگ کروائی تھی کہ کسی چیز کی کمی نہ رہ جائے اسے لگ رہا تھا اس کا جہیز تیار ہو رہا ہے دو دن بعد اس کی روانگی تھی وہ اس وقت بھی پیکنگ میں مصروف تھی۔ آرٹھ کبھی کبھی چھب دکھا جاتا تھا ورنہ آج کل وہ فل ریسٹ موڈ پر تھا۔ پیکنگ کرنے کے بعد وہ کھڑکی پر آکھڑی ہوئی، سفیدی میں ڈوبا منظر۔۔۔ وہ اک داستاں تھی جو شروع تھی۔۔۔ وہ اک داستاں تھی جو ختم ہوئی۔۔۔ حاصل پتا نہیں کیا ہے۔۔۔ اس نے اپنی ہتھیلی کھولی اور ہاتھوں کی لکیروں میں کچھ کھوجنے کی کوشش کی۔ جو خون کی کمی کے باعث زردی مائل سفید رہتی تھیں۔

”زندگی بس جینا ہے ہر حال میں کیری آن کرنا۔۔۔ اس بات پر سمجھوتہ کرنا کہ ہر سوال کا جواب نہیں مل سکتا ہاں مگر شاید مجھ جیسی کسی سارا کو کبھی کسی آنے والی صدی میں مل جائے۔۔۔“



یہ دنیا میں تانبے کا دور تھا اس قدر تہی اہرام اوپر چودھویں کا چاند چمکتا تھا ایک لڑکا جس نے جانور کی کھال سے خود کو ڈھانپا ہوا تھا ایک اصطبل نما جگہ پر گھوڑوں اور خچروں کے نزدیک سوکھی گھاس کے بستر پر بیٹھا شکار کا اوزار تیز کر رہا تھا اسی پل سارا آئی تھی وہ بھی جانور کی کھال سے بنے لباس میں تھی۔ آکر اس نے ایک پتھر اس کے سامنے رکھا وہ پتھر پر بنا نشان دیکھ کر دھیمے سے مسکرایا اور اسے گھوڑے پر سوار کروایا۔ یہ وہ دور تھا جب ایک دوسرے تک اپنا پیغام پہنچانے کے لیے کچھ نشان طے کر لیے گئے تھے۔ راستے میں پڑتے ایک اور اہرام نما غار سے انہوں نے اپنی دوست کو اٹھایا تھا تین گھوڑے چاندنی شب میں برفوں کا سفوف اڑاتے دوڑتے تھے۔ پیچھے غار سنہری آتشی روشنی میں جلتے تھے اور سامنے میدان چاندنی میں۔



وہ کیپڈو کیا کے علاقے جو ریم میں داخل ہو رہے تھے۔۔۔

”کیا یہاں میں پہلے آچکی ہوں۔۔۔“ اس نے پچھلی سیٹ سے پہلے جمال اور پھر سارہ کو دیکھا۔ جمال کی نظریں ڈرائیو کرتے ہوئے سامنے راستے پر جمی تھیں وہ غور سے سارہ کی کوئی بات سن رہا تھا۔ اس کے بال کانوں کو ڈھانپنے ہوئے کندھے تک آتے تھے اور سارا کی ہائی پونی ہر جھٹکے پر جھولتی تھی۔ گاڑی کی بئنگ پہلے سے ہی انہوں نے کروار کھی تھی کمپنی والے ائر پورٹ پر دینے آئے تھے۔ وہ یہاں پہلے کئی بار آچکے تھے سوسب کچھ پہلے سے ہی بک بھی تھا اور طے بھی۔ اس وقت جی پی ایس سیٹ کر کے اب وہ کیپڈو کیا کی طرف محو سفر تھے۔ نیلے آسمان پر کہیں کہیں بادل کے ٹکڑے تھے پھر اس نے عجب طرز کا لینڈ سکیپ دیکھا جیسا جنوں پر یوں کی کہانیوں میں پڑھا تھا۔ وہ کسی کے تخیل میں بسا کوئی شہر تھا شاید جہاں وہ داخل ہو گئے تھے۔ وہاں کا لینڈ سکیپ ایسا تھا جیسے ڈھیر سارے قدرتی اہرام ہوں، جن پر پتھر نکلے ہوں۔ کوئی چاند کی شکل کا کوئی چمنی جیسا، کوئی بونوں کی ٹوپی نما ان میں قدرتی سوراخ تھے۔ کچھ کو خود رہائش کے غرض سے بھی تراشا گیا تھا۔ پھر اس نے دن دیہاڑے وہ منظر دیکھا پورے چاند کی روشنی میں برف کا سفوف اڑتا تھا اور تین گھوڑے دوڑتے چلے جا رہے تھے۔



وہ گر جا گھر کے باہر پتھر کی گول سلیں گھماتا تھا دور کہیں ایک درہلکے ارتعاش کے ساتھ کھل رہا تھا، گلے میں صلیبیں ڈالے وہ مسیحی سپاہی دروازے کے کھلنے کی آواز سے حرکت میں آئے تھے اب انہیں کچھ عرصے کے لیے زیر زمین اس غاروں کے شہر میں رہنا تھا۔ وہ ایک مقرر وقت کے بعد اب دوبارہ سلیں گھما رہا تھا پیچھے سارہ کی اچانک آمد سے چونکا تھا اس کے ہاتھ میں کپڑے سے بنی گڑیا تھی۔ وہ بہت خوبصورت گڑیا بنایا کرتی تھی اور گلی گلی پھر کر بیچا کرتی تھی۔



شہر میں داخل ہونے سے پہلے کچھ دیر کے لیے جمال نے گاڑی روکی تھی، ایک طرف کچھ شاندار قسم کے بھاری بھر کم بھورے اونٹ بیٹھے تھے جیسے وہ اسی ماورائی تھلیاتی کہانی کا ایک حصہ ہوں۔ سورج کی روشنی درختوں کو بگھور ہی تھی۔ وہ کتنی دیر اس منظر میں تحلیل رہے پھر آگے بڑھے۔

ان کے کمرے کیو ہاٹل میں بک تھے۔ یہاں زیادہ تر ہاٹل غاروں کو کاٹ کر بنائے گئے تھے۔ ہلکا سنہرا کمر اسنہری روشنیوں سے نہایا ہوا، کھڑکی پر سفید پردے بھی سورج کی نرم روشنی میں سنہرے لگتے تھے۔ سامنے ایک ٹیبل پر چائے کافی کا انتظام تھا ساتھ ڈریسنگ ٹیبل، بیڈ کے سائیڈ پر الماری بائیں طرف کونے میں باتھ روم چھت پر جگہ جگہ سنہرے فانوس لگے تھے جو کمرے کو سنہری روشنی سے بگھوتے تھے۔ وہ سامان رکھ کر باہر نکلی ہاٹل چونکہ غار میں تھا اس لیے ارد گرد کے سارے کمرے اڑھے ترچھے تھے، مرکز میں سے اوپر کی طرف سیڑھیاں جاتی تھیں۔ جمال گاڑی پارک کرنے کہیں دور گیا تھا اور سارہ اپنے کمرے میں بند تھی وہ چھت پر آگئی۔ چھت پر رنگین نشستیں تھیں جہاں بیٹھ کر اس ماورائی شہر کا نظارہ کیا جاسکتا تھا۔ دائیں طرف میس تھا جہاں ناشتہ اور چائے ملتی تھی۔ اس نے گہری سانس لی ایسا لگا سورج کی زرد روشنیوں میں ان اونچی نیچی پتھریلی گلیوں میں بے شمار بونے دوڑ رہے ہوں اور اسے ڈھونڈتے ہوں وہ وہیں بیٹھی رہی یہاں تک کے سارا شہر سائے میں تبدیل ہونے لگا اور جمال اور سارہ نیند پوری کر کے اوپر آگئے تھے۔

وہ تینوں واک پر نکلے تھے ہاٹل سے ایک ڈھلوان کی صورت گلی نیچے اتر رہی تھی پھر سامنے سے ایک گلی گزرتی تھی جس کے دائیں کنارے پر ایک آرٹ شاپ اور ساتھ کپڈو کیا کے لینڈ سکیپ کی چیز ہر رنگ میں دھرے تھے۔ سارا نے دکان میں جھانکا۔ وہ سڑک پر اتر آئے درجہ حرارت بے حد کم تھا مگر برف باری وغیرہ کے کوئی آثار نہیں تھے پھولوں کی مہک تھی۔ یہاں پر آئے سیاحوں میں یورپ کے لوگ زیادہ تھے وہ شہر بھی بالکل یورپ کے طرز کا ہی تھا۔

سارا منظر جیسے کسی خواب کا حصہ تھا، میوزک، آرٹس کرافٹس کی دکانیں، ریسٹوران وہ دیکھتے گئے۔ رک کر ڈنر بھی کیا پھر آگے بڑھ گئے۔ چلتے چلتے مٹی سے بنی چیزوں کی دکان راستے میں آئی تھی۔ سارہ کے کہنے پر تینوں سیریمک ہاؤس گھسے تھے یکدم جیسے کسی رنگوں کے جہان میں آگئے تھے۔ آرٹس سے ملنے کے بعد اس نے جانا تھا کہ رنگ باتیں کرتے ہیں ان کے معنی اور پیغام ہوتے ہیں۔ وہاں رنگ رنگ کے مٹی سے بنے ہاتھی، فیری چمنیز، برتن، انگوٹھیاں، الو، پرندے، کچھوے، خطاطی کے شاہکار، ہاتھ سے بنائی تصویریں، مرتبان پڑے تھے۔

سارہ چونکہ لمبے عرصے کے لیے وہاں کھو گئی تھی اس لیے وہ اور جمال باہر آگئے۔
 ”تم یہاں آکر خوش نہیں ہو؟“ سارا نے جمال سے پوچھا تھا۔
 ”یہ کیوں لگا؟“

”یوں ہی۔۔۔ لگا۔۔۔ ایسے جیسے تم ادا اس ہو۔“ وہ رک رک کر بولی تھی، اسے اکثر بولنے میں ایسے ہی دشواری ہوتی تھی۔

”نہیں۔۔۔ ہاں شاید۔۔۔ یہ موڈ مجھ پر یہاں آکر طاری ہو جاتا ہے۔۔۔ میں پہلی دفعہ یہاں امی بابا کے ساتھ آیا تھا۔“
 ”ہنہ۔۔۔“

”یہاں آنا میری دل کی سب سے بڑی خواہش ہوتی ہے۔۔۔ یہاں آکر مجھے کچھ ان دیکھا کچھ بیت چکا محسوس ہوتا ہے۔“
 ”جیسے؟“

”پاکستان میں کبھی کبھی میں اپنی اس لائف کو مِس کرتا ہوں جو میں نے نہیں جی۔۔۔ لیکن یہاں آکر مجھے لگتا ہے وہ لائف میں نے کبھی جی تھی یہیں

کہیں شاید۔۔۔“ سارا نے دیکھا شوخ رنگوں کے چمکتے پلاسٹک کے پنکھے دکان والے نے بیچنے کے لیے باہر رکھے تھے۔ اس نے ایک اٹھا کر انگلی سے گھمایا ہلکی ہوا اور کچھ اس کی انگلی قوت سے وہ گھومنے لگا تھا۔ اس کے چہرے پر اس کی رنگین روشنیاں پڑنے لگیں۔

”تمہارے ساتھ تو سب ہیں نا اتنے سارے لوگ۔۔۔ پھر بھی۔۔۔“ وہ جو کہنا چاہ رہی تھی وہ سمجھ رہا تھا۔

”پتا نہیں سب کے ساتھ ہونے کے باوجود میں اپنے اندر کی خند قوں سے کتنی بار سروائیو کر کے لوٹا ہوں، یونوماں باپ کے بغیر کیسی زندگی ہو سکتی ہے انسان کی۔“ وہ خاموش رہی تھی۔

”اور یہاں مجھے ان پہاڑوں کو دیکھ کر چین کی چاند پہاڑی یاد آرہی ہے۔“ جمال نے بات بدلی تھی۔

”کیسی تھی؟“

”نیچر زما سٹر پیس۔۔۔ میں کافی اونچائی تک چڑھ گیا تھا؟“

”مجھے یہ رقص درویشاں دیکھنا ہے۔“ وہاں درویش ہاؤس کا بورڈ دیکھتے ہوئے وہ بولی تھی۔ جمال نے بھی وہ بورڈ دیکھا تھا۔ سڑک پر ویرانی چھا رہی تھی، بڑے بڑے پتھروں سے بنا ایک گھر جس کی چھت کی نوک پر چاند چمکتا تھا، وہ اس کے پاس سے گزرے۔ انہی پلوں میں سارا نے جوتے اتار کر ہاتھوں میں پکڑ لیے تھے وہ دھیرے دھیرے لاکھوں سال پہلے وجود میں آئے نقوش پر اپنے قدم دھرتے تھے۔

”میرے ہاتھوں سے ان دو قبروں کی مٹی کا لمس نہیں جاتا۔“ اس نے اپنے ہاتھ اپنے سامنے پھیلائے۔ سارا نے دیکھا اس کے ہاتھوں پر بالکل اس کے جیسی لکیریں تھیں۔ اس نے قریب سے چند پھول توڑے اور اس کی ہتھیلی پر ڈال دیے۔

”ارے رکو۔۔۔“ سارہ دوڑتی ہوئی ان کے پیچھے آئی تھی۔

”کمال کرتے ہو تم لوگ۔“ اس کے ہاتھ میں تین چار شاہ پر زتھے۔

وہ لوگ کافی دیر تک ہاٹل کی چھت پر بیٹھے قہوہ پیتے رہے گانے سنتے رہے۔ قریب بیٹھے ایک گروپ میں لڑکا گٹار بجا رہا تھا اور انگریزی غزل گاتی اس لڑکی کی آواز کمال کی تھی۔ سارا انہیں سنتی تھی اور گھوڑے کی ٹاپ کو۔۔۔

دور چاندنی میں برف کا سفوف اڑتا تھا۔۔۔ ایک لڑکی گر جاگھر کی بلند کھڑکی سے جھانکتی تھی۔ صبح اس کی آنکھ جلدی کھل گئی تھی بھورے پتھر کے کمرے سے باہر نکلی باہر ہاٹل میں ویرانی کا راج تھا وہاں اس کے کمرے کے ساتھ دو کمرے اور تھوڑی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر تین کمرے تھے۔ گلی میں دو جانب سے دروازے کھلتے تھے۔ وہ الجھے الجھے بالوں پر ہاتھ پھیرتے بغیر سویٹر شال میں اوپر آگئی سورج طلوع ہو رہا تھا اور سارا آسمان ہوائی غباروں سے رنگین تھا وہ آسمان پر تیرتے تھے۔

”ہم کیوں نہ کچھ ایسا بنائیں جس سے ہوا میں تیر سکیں۔“ وہ یاد کر کے مسکرائی تھی۔

”آرٹھ کیا ابھی بھی خراٹے لے رہا ہو گا۔“ بے وجہ دوست یاد آیا تھا۔

کائنات وجد میں تھی آتش فشاں پھٹ پڑا تھا لاوا بہنے سے موسیقی پیدا ہوتی تھی، سارا جمال کو کچھ پتھر پر لکھا دکھاتی تھی، سارہ ایک گڑیا لیے کھڑی تھی اور رنگین غبارے آسمان میں تیرتے تھے۔۔۔ اس نے نگاہوں کی تپش محسوس کی کچھ اندر میس میں بیٹھی ترکش عورت اخبار پڑھتے گا ہے بگا ہے اس پر نظر ڈال لیتی تھی۔ وہ اندر چلی آئی اور اپنے لیے کافی بنانے لگی وہاں ویٹر کے طور پر لڑکا کام رکھ رہا تھا ناشتے کی چیزیں، ابلے ہوئے انڈے، سلاد، چائے کافی، بسکٹ، دودھ ٹیبل پر سجا رہا تھا تاکہ ہاٹل میں ٹھہرے لوگ اپنی مدد آپ کے تحت جو کچھ بنانا ہو بنالیں۔ یہ لڑکا پاکستان سے تھا ہزارہ سے کل اس کے ساتھ جمال خوب

گپ شپ اردو میں لگاتا رہا تھا۔ وہ کافی کاگ تھامے سبز رنگ کے بدھا کی تصویر کے سامنے آکھڑی ہوئی ارد گرد بہت سی تصویریں تھیں جو دنیا کے مختلف علاقوں کی تھیں۔ ہائل کے مالک کو سیاحت کا شوق ہے وہ ہر سال کسی علاقے میں جاتے ہیں یہ تصویریں سب ان کا کرشمہ ہیں اس پاکستانی ویٹر نے کل بتایا تھا۔ وہ کتنی دیر سبز بدھا کے پرسکون چہرے کو دیکھتی رہی یہ غالباً تھائی لینڈ کے اس مجسمے کی عکاسی تھی جسے زمرد کے ایک ہی ٹکڑے سے تعمیر کیا گیا تھا۔ اتنے میں ایک بلی آکر اس کے پاؤں سے لپٹ گئی تھی اس نے دو انگلیوں سے اس کا سر سہلایا اور واپس مڑی چھت سے نیچے کی جانب جھانکا سارہ جمائیاں لیتی باہر نکلی تھی۔

”گڈ مارنگ۔“

”گڈ مارنگ۔“ وہ مسکرائی تھی۔ اس کی مسکراہٹ اس مسجد کے مینارے جیسی تھی جو سورج کی روشنی میں دمکتا تھا۔

انہوں نے کوئی ٹوور پیکیج نہیں لیا تھا ورنہ یہاں سبز نیلا لال ٹوور پیکیج جس میں ہوائی غباروں میں آسمان کی سیر، غاروں کے شہر کی سیر اور مختلف گر جاگھر، میوزیم اور وادیاں دکھانا ہر چھوٹے بڑے پیکیج کے حساب سے شامل تھا۔ اس کے بجائے انہوں نے اپنی گاڑی بک کروائی تھی جی پی ایس آن کیا تھا اور سیر کو نکل کھڑے ہوئے تھے۔ سارا دن وہ غاروں میں، چاند پہاڑوں میں، گلاب وادیوں میں پھرتے رہے جہاں قدرت کی، قدامت کی، سبزے کی، مہک کی، کسی ان دیکھی جھیل کے پانیوں کی دہشت طاری تھی۔ عجب الخلقت غار پہاڑ منہ کھولے کچھ مسکراتے تھے کچھ روتے تھے۔

دوپہر کے کھانے کے وقت جب وہ پانچویں صدی میں تعمیر کیے گئے وہاں کے سب سے قدیم گر جاگھر کے سامنے آکر بیٹھے تو سارا کی نظر وہاں درخت کے نیچے لگے نوٹس پر پڑی تھی۔

”یہاں گھر میں بنی تازہ شراب دستیاب ہے۔“ وہ با آواز بلند پڑھ گئی تھی۔

”کیوں پنی ہے؟“ سارہ نے ازراہ مذاق سنجیدگی سے پوچھا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔
 ”نہیں۔“ نفی میں سر ہلایا۔ سارہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

وہ گر جاگھر دور سے کوئی عظیم قلعے کا روپ دھارے ہوئے تھا، قدیم پتھروں میں
 کھودا گیا تھا۔ دیواروں اور چھتوں پر سرخ، سبز رنگدار شمشیں تھیں۔ اندر سے اس قدرتی
 ہیئت زدہ کرتی پتھرلی جسمات کو کھود کر روزن اور دیواروں کے ساتھ چوکور خانے بنائے گئے تھے۔

وہاں سارا گلے میں صلیب پہنے بلند کھڑکی پر کھڑی بہت نیچے دیکھتی تھی جہاں سے گھوڑوں پر
 سوار صلیبی سپاہی دھول اڑاتے چلے جا رہے تھے پھر اس نے پلک جھپکی تو وہاں کوئی نہیں تھا۔
 پھر کتنی دیر وہ گھوڑوں کے فارم ہاؤس میں رہے جہاں سارہ اور جمال گھڑ سواری کرتے اور بگی
 چلاتے رہے وہ بیٹھ کر ان کو دیکھتی رہی۔

شام ڈھلے ان کی واپسی ہوئی تھی جمال نے ہاٹل کے مینیجر کو رات کا ایک شو بک کروانے کا کہا تھا
 جس میں رقص درویش اور ترکی کے ثقافتی شوز سب شامل تھے، کھانا بھی پیکیج میں شامل تھا۔

گاڑی ان کو پک کرنے آئی تھی وہ وہاں پہنچے تو ویٹر نے ان کو ہال میں بک ٹیبل پر بٹھایا تھا۔ ہال
 دائرے کی صورت میں تھا، بیچ میں جگہ خالی تھی جہاں شو پیش ہونا تھا اور باقی چاروں طرف پارٹیشنز میں
 لوگ بیٹھے تھے۔ فیملیز، اور لڑکے لڑکیوں کے گروپ آئے ہوئے تھے جنہوں نے ہنگامہ برپا کیا ہوا تھا۔
 شو شروع ہونے سے پہلے کھانا سرو ہونے لگا تھا تاکہ لوگ شو دیکھتے ہوئے لطف اندوز ہو سکیں۔ آن کی آن
 میں ویٹر نے ان کا ٹیبل بھرنا شروع کر دیا تھا کباب، تکه، چاول، سلاد، ساسز، حمص۔۔۔ اسی اثنا میں ان
 کے بالکل سامنے کونے میں بیٹھے موسیقاروں نے موسیقی کی ابتدا کی۔ وہ ہال کا انٹیریر دیکھنے میں محو ہو گئی
 جو سنہرے پتھر سے بنا تھا، جابجا پینٹنگز اور روشن ققموں سے تزیین کی گئی تھی جو ترک ثقافت کی عکاسی کر
 رہی تھیں۔ سارا نے موسیقی سنتے سنتے اپنے سامنے دیکھا ویٹر ابھی مزید چیزیں رکھنے میں مصروف تھا۔ اس

کے سامنے بالکل شراب کی بوتل رکھ دی تھی۔ اس کا چہرہ یکدم سرخ ہوا تھا اس نے جلدی سے اٹھا کر سائیڈ پر پٹنی سارہ ہنس پڑی تھی۔

”یہ بہت عجیب ہے یہاں یہ چیز اتنی زیادہ عام کیوں ہے؟“

”کیونکہ یہاں مسلمان ملکوں سے زیادہ دوسرے لوگ آتے ہیں اور ان کا اس چیز کے بغیر گزارا نہیں ہے۔“

شو شروع ہو چکا تھا رقص درویش سے آغاز کیا گیا تھا۔ سارے ہال میں بتیاں مدھم کر دی گئیں اور نے کی آواز گونجنے لگی۔ وہ سبز، سفید، سیاہ لبادوں میں ملبوس ان کے سامنے جھکتے تھے اور انا کی فنا کا اعلان کرتے تھے۔

اپنے ہاتھ باندھ لے اپنے گرد خود کو تھام لے اب کائنات کے ساتھ رقص میں شامل ہو جا۔۔۔
اپنے گرد ایک بار طواف کر کے تو دیکھ تجھے کسی کی حاجت نہیں کہیں پہنچنے کے لیے،
ایک انگلی اٹھا اوپر دیکھ کائنات کو اپنی لپیٹ میں لے لے اور اس کے احد ہونے کا اقرار کر۔۔۔ اب
ہاتھ پھیلا دے اور جذب ہو جا رقص کر اور جذب ہو جا۔۔۔

وہ شاید نہ لوٹتی آسمان سے اگر وہاں طنبورہ ڈانس اس کے بعد نہ شروع ہو گیا ہوتا۔ لوگ کھانا کھا رہے تھے لطف اٹھا رہے تھے وہ بھی ان میں شامل تھی اور نہیں بھی تھی۔

طنبورہ بہت سی تاروں والا ایک خاص موسیقی کا آلہ بھی ہوتا ہے، طنبورہ ایک دریا بھی ہے، طنبورہ وہ بھی ہے جو خود دکھائی نہ دے مگر رقص کرتا محسوس ہو۔ وہ روشن رنگین تاروں سے مزین اپنے خاص فراک میں کھڑی تھی پھر اس نے رقص شروع کیا اوپر والی تہیں اتارنے کے ساتھ ہی ہال کی بجلیاں بند کر دی گئیں اب وہاں وہ عورت غائب تھی صرف گول دائرے میں بجلی رقص کرتی تھی۔

اس کے بعد ان کے ثقافتی رقص اور رسمیں ٹیبلو کی صورت دکھائی گئیں۔ اس میں وہاں بیٹھے

لوگوں نے سب سے زیادہ حصہ لیا اور لطف اٹھایا تھا۔ وہاں پر فارمرز نشستوں پر بیٹھے لوگوں کو بلا کر دلہایا دلہن بنا کر رسمیں کر رہے تھے۔ انہوں نے شادی بیاہ، فتح اور جنگ کے سارے رقص اور گیت پیش کیے۔

اور پھر یکدم شوکی کا یا پلٹی تھی کم از کم اس کے لیے۔ اس گروپ کے جاتے ہی وہ تیز آتش گلابی غازے میں اپنے چہرے پر نئی نئی ابھرتی جھریوں کو چھپائے، چاندی رنگ اور نیلے پاؤں کو چھوتے لباس میں داخل ہوئی تھی۔ سارا نے ایک نظر دیکھا پھر نظر جھکائی پھر بمشکل دوبارہ اسے دیکھا۔ وہ بیلے ڈانس کر رہی تھی۔ لوگ اسے رقص کرتے دیکھ کر لطف اٹھا رہے تھے اور اس کا جسم اور لباس دیکھ کر اس کا چہرہ جھکتا جا رہا تھا۔۔۔ کیا وہ ہسپانیہ کی

ماریہ تھی جو رقص کرتی تھی؟ لڑکے اس بڑی عمر کی غازے میں ڈوبی عورت سے نگاہیں نہ ہٹاتے تھے، وہ ہسپانیہ سے اٹھ کر اس کے سامنے کیوں آگئی تھی۔ اس کا دم وہاں اسے رقص کرتے دیکھ کر گھٹنے لگا تھا وہ یکدم اٹھی۔

”میں ابھی آئی۔“ جمال اور سارہ کو کہتے ہوئے وہ باہر نکل آئی تھی راہداری عبور کر کے لان میں آگئی۔ باہر مدھم مدھم روشنیوں میں وہاں بیٹھے لوگ رات کے کھانے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ وہ اندھیرے میں رکھی ایک کرسی پر جا بیٹھی۔

”کیا واقعی کہانیاں ٹھہری ہوئی ہیں اور انسان اس میں سے گزرتے ہیں؟ ہمیں کس کہانی سے گزرنا ہے یہ کون طے کرتا ہے۔۔۔“

”یہ مشیت ایزدی طے کرتی ہے۔۔۔ اور یہ ہم طے کرتے ہیں۔“ اس کی آنکھیں یہ سوچتے ہوئے نم کیوں ہو رہی تھیں۔

”تم یہاں کیوں بیٹھی ہو؟“ جمال پیچھے آیا تھا۔ وہ جواب میں کچھ نہیں بولی۔

وہ کچھ دیر دیکھتا رہا پھر مسکرایا۔

”کیا تمہیں برا لگا؟“ اس کے چہرے پر لکھا تھا کہ اسے برا لگا۔

”ہمیں ہر طرح کے لوگوں کے ساتھ اور ہر طرح کے ماحول میں خود کو کیری کرنا آنا

چاہیے۔“ وہ اس کے سامنے آبیٹھا تھا۔

وہ اب کی بار بھی کچھ بولی نہیں تھی۔

”تم کچھ زیادہ محسوس کر گئی ہو۔۔۔“

”میں نے وہ محسوس کیا جس کا شعور اس کی ذات کو نہیں تھا یا شاید تھا اور وہ اسے چھپائے ہوئے

تھی۔“ وہ اپنے ہاتھوں پر نظر جمائے ہوئے تھی۔

”شو ختم ہو چکا ہے سارہ آرہی ہے پھر نکلتے ہیں۔“ وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولا تھا۔

”مجھے یہ شہر ہمیشہ فلنٹ سٹون کی یاد دلاتا ہے۔“ سارہ نے منفی آٹھ کے قریب ہوتے درجہ

حرارات میں حسب سابق کلکتے ہوئے کہا۔ گاڑی انہیں بڑی سڑک پر اتار گئی تھی اور اب وہ پیدل ہاٹل کی

طرف رواں تھے۔

”پتھر کے دور کا جدید گھرانہ، دامادرن سٹون ایج فیملی۔۔۔“ جمال نے جو ریم کی گلی میں ایک

چھوٹا سا قدیم پتھر پاؤں کی ٹھوکر سے اڑایا۔

Flintstones, meet the Flintstones...

(فلنٹ سٹون، فلنٹ سٹون سے ملو۔۔۔)

They're the modern Stone Age Family...

(ایک جدید دور میں پتھروں سے نسبت رکھتا خاندان۔۔۔)

سار اگنگنا نے لگی تھی، وہ گلی میں بلندی کی طرف قدم اٹھا رہے تھے۔ اس پل جمال نے آسمان کی طرف دیکھا تھا، اس کی آنکھیں یکبارگی میں کروڑوں چراغوں کی روشنی کی زد میں آگئیں۔ اس نے پلکیں جھپکیں اور گھوم کر ان دونوں کو پیچھے آتے دیکھا دونوں نے جمال کی جلتی آنکھیں دیکھیں تقلید میں سر اٹھایا، آسمان کی طرف دیکھا اور مبہوت ہو گئیں۔

From the town of Bedrock...

(وہ پتھروں کے قدیم شہر سے ہیں۔۔۔)

They're a page right out of history...

(وہ تاریخ کا پرانا ورق ہیں۔۔۔)

سارا پھر سے ہولے ہولے گنگنا نے لگی تھی۔

دور کہیں گلاب وادی میں کسی آتش فشانی پتھر سے ٹیک لگائے وہ پتھر پر دل میں ابھرتا کوئی خیال کھودتی تھی، قریب اس کے دو دوست لکڑیاں جلا کر آگ سلگاتے تھے اور گھوڑوں کے ہنہانے کی آواز اس پل اس قدیم وقت سے سارا کی آواز کے ساتھ آ شامل ہوئی تھی۔

When you're with the Flintstones...

(جب تم کسی فلنٹ سٹون کے ساتھ ہو۔۔۔)

Have a yabba-dabba-doo time...

(تو تو لطف اٹھاؤ۔۔۔ یا باڈا باڈو ٹائم۔۔۔)

جمال کی آواز بھی اس کی آواز کے ساتھ آ شامل ہوئی۔ اب وہ لوگ ہاٹل کی طرف جانے والی گلی میں مڑے تھے جہاں کچھ غاروں کے اندرونی اندھیرے ڈراؤنے دکھتے تھے۔
”یا باڈا باڈو ٹائم۔۔۔“ سارا کھلکھلائی۔

We'll have a gay old time

(ہم یہاں خوشیوں بھرا قدیم وقت گزاریں گے۔۔۔)

وہ تینوں گاتے ہوئے ہائل میں غائب ہو گئے۔



گاڑی اس خشک سنہرے سرد علاقے میں رواں تھی۔ سرمئی ویران، بل کھاتی سڑک جیسے زندگی۔۔۔ بھورے دور سے سیاہ لگتے قدیم عجب الخلق پہاڑ جیسے کوئی تمہیں مرنے نہ دینا چاہتا ہو۔۔۔ روکتا ہو۔ یکدم گاڑی کو بریک لگی تھی سارا کاسر سامنے سیٹ پر بری طرح ٹکرایا۔ وہ اس جھٹکے کے لیے تیار نہیں تھی۔ تینوں ہائل سے جو ریم پیڈ ریمک ویو پوائنٹ جانے کے لیے نکلے تھے۔ جہاں سے سے جو ریم کی ماورائی زمین کا پھیلتا منظر سیاح دیکھنے آیا کرتے ہیں۔

”کیا ہوا؟“ سارہ نے مڑ کر اس کے صحیح ہونے کی تسلی کی اور پھر جمال کو گھورتے ہوئے کہا۔

”یہاں لگتا ہے کوئی جھیل ہے۔۔۔“ جمال یہ کہتے ہوئے گاڑی سے نیچے اتر آیا تھا۔

وہ خشک بنجر علاقہ تھا مگر پھر تینوں نے وہیں کھڑے کھڑے دور سے اس زمر جھیل کے آثار دیکھے۔ اس تک پہنچنے کے لیے کافی نیچے اترنا تھا۔۔۔ وہ بغیر ایک دوسرے کو کچھ کہے نیچے اترنے لگے۔ علاقہ ویران تھا صرف ایک گاڑی کھڑی تھی جس کی سواریاں بھی واپسی کی تیاری میں تھی، آبادی صرف چار پانچ کتوں کی تھی جو شاید کئی دن سے بھوکے تھے کہ ان کے پیٹ چپکے پڑے تھے وہ بولائے بولائے سے پھرتے تھے۔ وہ لوگ احتیاط سے وہاں سے گزر کر جھیل تک جاتی ڈھلوان تک آئے وہاں اس پر بچے سنگ ریزوں، کنکریوں، پتھروں پر پاؤں رکھتے، پھسلتے نیچے اترنے لگے۔

”یہ نار (انار) جھیل ہے۔“ جمال نے اعلان کیا۔ وہ کنارے پر پہنچ چکے تھے۔

”جس کلاسٹ ٹائم میں ذکر کر رہا تھا ہمیں ملی نہیں تھی۔۔۔“

”اور کبھی تم کسی کو قریہ قریہ تلاش کرتے ہو اور وہ نہیں ملتا اور پھر ایک دن اچانک کسی بھولے بسرے خواب کی طرح آنکھوں میں آسماتا ہے۔“ سارہ کھوئے کھوئے بولی تھی۔ وہاں کی خاموشی مدہوش کر رہی تھی جگہ جگہ خود روزرد پھول کھلے تھے ہر یا ول اور مرجھاتے نارنجی ہوتے درخت دونوں موجود تھے۔ عجب امتزاج کی زمین تھی جیسے زندگی اور موت سہیلیاں بنی ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے چوڑی کھنکھاتی، پائل چھنکاتی ساتھ ساتھ چلتی ہوں۔

نیلا ہٹ مائل زمر درنگ میں سورج کا عکس دکھاتا تھا، جھیل کے کنارے پر سرکنڈوں کی بہتات تھی۔

”یہ جھیل لاوا پھٹنے کی وجہ سے وجود میں آئی تھی۔“ جمال کی آواز میں جھیل کی ہیبت کی وجہ سے ارتعاش در آیا تھا۔

”آتش فشانی بھی زندگی کا باعث ہوتی ہے۔۔۔“ سارا بھی متاثرہ سے لہجے میں بولی۔

”ہاں اس دنیا میں ہونے والا ہر سانحہ اور وہ جو ہو گا وہ زندگی کا باعث ہے اور ہو گا سوائے قیامت کے۔۔۔“ سارا نے اپنا ہاتھ جھیل کے گندھک والے پانی سے تر کیا تھا۔

”یہ شفا دیتی جھیل ہے۔۔۔“ اس نے گندھک کی خوشبو کو محسوس کیا تو دھیرے سے بولی تھی۔

”ہاں روح کو سیراب کرتی۔“ پتا نہیں یہ جمال نے کہا تھا یا سارہ نے۔

”میں جب بھی کسی ایسی جگہ آتی ہوں تو مجھے یہ سوچ کر وحشت ہوتی ہے کہ ہماری زمین ان سب کو۔۔۔ اس حسن کو کھودے گی۔۔۔ جس طرح کا ہم اس زمین کے ساتھ سلوک کر رہے ہیں مستقبل میں ہم جنگلات سے محروم ہو جائیں گے۔۔۔ چرند پرند نایاب ہو جائیں گے۔۔۔ فصلیں اگانا مشکل ہو جائے گا اور گلوبل وارمنگ۔۔۔“ یہ سارہ تھی۔

”ایسا نہیں ہو گا۔۔۔“ یہ بھی سارا تھی۔

”جیسے چوٹ لگتی ہے تو خود بخود healing process (خود کار شفا یابی) ہوتا ہے اس طرح قدرت بھی خود کار طریقے سے شفا یاب ہوتی رہتی ہے۔ یہ زمین صرف اس وقت انسان اور اس حُسن کا بوجھ برداشت نہیں کر پائے گی جب قیامت آئے گی۔“

”کیا انسانی بد اعمالی سزا بن کر اس کے سامنے نہیں آتی۔“ سارہ بحث کے موڈ میں آگئی تھی۔

”زمین جب مرنے لگے گی اور جانور ختم ہونے لگیں گے۔۔۔“

تو انسانوں کا ایک نیا قبیلہ زمین پر وجود میں آئے گا۔۔۔

اس قبیلے میں ہر رنگ نسل، عقیدے اور جماعت کے انسان ہوں گے۔۔۔

جو اپنے عمل سے دنیا کو سبز کر دیں گے۔۔۔

وہ قوس قزح کے جنگجو کہلائیں گے۔۔۔“

سارا نے ہونپی دیو مالائی پیش گوئی گنگناتے ہوئے جمال کو دیکھا جو شاید اس وقت وہاں موجود نہیں تھا۔

“The warriors of rainbow...”

سارہ نے اس کی گنگنا ہٹ کا آخری جملہ اچک کر انگریزی میں بولا۔

”اور ایسے قبیلے کا وجود میں آنا جو زمین کی مٹی کے لیے درد مندی رکھتا ہو اصل میں قدرت کی خود کار شفا یابی ہی ہے۔“ سارہ کے ہونٹوں پر مسکان پھوٹی تھی جو کہتی تھی میں متفق ہوئی سہیلی۔

وہاں سے واپسی پر جمال نے انہیں تنبیہ کی تھی کہ تیز قدم اٹھا کر جلد گاڑی میں بیٹھیں کیونکہ اس وقت اس پورے علاقے میں کوئی بھی نہیں تھا اور وہ پانچ چھ کتے اس طرح گھوم رہے تھے جیسے ان کی واپسی کی راہ تکتے ہوں۔

وہ آگے بڑھے تو ماؤنٹ ایر سیئس (Mount Erciyes) کی چھب دکھنے لگی تھی یہ ان

تین آتش فشاں میں سے ایک پہاڑ ہے جس کے باعث کپدوکیا کی یہ دلکش، ماورائی زمینی ساخت وجود میں آئی ہے باقی کے دو آتش فشاں پہاڑ حسن (Hasan) اور گلو (Güllü) داگ ہیں۔ ترکش میں داگ پہاڑ کو کہتے ہیں۔

کچھ دیر بعد وہ ہسپینوریمک ویوپوائنٹ پر تھے جہاں وہ مشرومز نما پہاڑ کھڑے تھے جن کی نوک پر ایک ایک پتھر ٹکا تھا۔ کچھ لڑکے قریب جا کر چڑھنے کی کوشش بھی کرتے تھے اور جمال اور سارہ نے بھی اپنا مقدور بھر حصہ ڈالا۔ وہیں قریب تھوڑی سی بلندی پر ایک چھوٹا سا بازار تھا جہاں ہاتھ سے بنی اشیاء، کھلونے، ساونیرز، سکارف، کوٹ وغیرہ موجود تھے۔

دوپہر کے کھانے کے بعد ان کی منزل ایک آئینہ گر جاگھر تھا۔ وہ گر جاگھر قدامت کی عجب سی آماجگاہ تھی جہاں سانس لیتے ہوئے سارا کے لاشعور میں کوئی دیا جلتا تھا۔۔۔ شاید کبھی اس نے وہاں اندر دیا جلایا تھا۔۔۔ شاید وہاں اندر اس نے کسی انہونی خواہش کا اظہار کیا تھا اور ان پلوں میں اس دیے کی روشنی میں اس کا چہرہ دمکتا تھا جیسے ابھی آسمان پر چلتے زرد دیے کی روشنی میں دمک رہا تھا۔

بلندی پر گاڑی کو کچھ دیر کھڑا کر کے تینوں نے نیچے کا منظر دیکھا تھا، آدھا چھاؤں اور آدھا دھوپ میں ڈوبا منظر۔۔۔ ایک خاموش سڑک جو اس گر جاگھر تک اترتی تھی۔۔۔ گر جاگھر تک سارا سہ خشک پتوں اور خود رو جھاڑیوں سے بھرا تھا اور گر جاگھر کے قریب وہ ایک شجر۔۔۔ جیسے زمانوں سے کسی عہد کو نبھانے کی خاطر کھڑا ہو۔ عمارت یوں لگتا تھا کچی مٹی سے بنی ہے جیسے تھر کے کسی اداس گاؤں میں بنا گھر اور اندر سے ایسے جیسے پنیر کے ٹکڑے میں سوراخ۔

یہ اینالی کلیسے (Aynali Kilise) تھا۔۔۔ آئینہ گر جاگھر، ایک راز۔۔۔ اس کی جیومیٹرکل آرائش کی وجہ سے یہ آئینہ گر جاگھر کہلاتا ہے۔ گر جاگھر کو کپدوکیا کے قدیم پتھروں میں تراشا گیا ہے جس کا ایک درمیانی حصہ ہے اور دو بغلی راستے۔ چھوٹا سا داخلی دروازہ۔۔۔ رنگ جو

دیواروں کی آرائش کے لیے استعمال کیے گئے ہیں وہ سرخ اور سفید ہیں۔ وہ لوگ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں داخل ہوئے جہاں ایک بچھو کی پینٹنگ تھی۔

یہاں سے اوپر ایک تنگ زینہ جاتا تھا جہاں ایک کمرے میں طاق زدہ دیوار تھی۔
 ”یہاں کسی زمانے میں دیے جلتے ہوں گے۔“ کوئی سیاح کہہ رہا تھا شاید۔ سارا نے اندھیرے میں دیوں کے پاس کھڑے اسے سنا تھا وہ یہاں دعا مانگنے آئی تھی۔ ایک کمرہ گر جاگھر کی پچھلی جانب تھا۔



وہ جانور کی کھال پہنتے تھے، گھاس پتے اور پرندوں کا گوشت کھاتے، لکڑیاں جلا کر رات گزارتے اور سارا سارا دن گھوڑوں پر آگے بڑھتے جاتے، ان کی منزل کیا تھی وہ یہ نہیں جانتے تھے مگر انہوں نے یہ طے کیا تھا وہ اس زمین کے آخری کنارے تک جائیں گے وہ چلتے جائیں گے جب تک زمین ختم نہیں ہو جاتی مگر یہ کیا وہ آگے بڑھتے جاتے تھے زمین بڑھتی جاتی تھی ان کو گمان نہیں تھا کہ اس کا کنارہ اتنا دور ہو گا۔۔۔ اور اب وہ سوچتے تھے شاید زمین کا کوئی کنارہ نہیں ہے۔



”اس زمین کا کوئی کنارہ نہیں ہے۔۔۔ یہ زمین پوری کائنات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔۔۔ اور میں یعنی کہ سارا اس ساری زمین کو فتح کرنے نکلی ہوں۔۔۔ میں چھوٹے چھوٹے قدم بھروں گی اور وہاں پہنچوں گی جہاں اس کی آخری حد ہے۔۔۔“ سارا چلتے چلتے مدہوش سا بول رہی تھی۔ “جمال اور سارا اس کے پیچھے بیگ کندھوں پر لٹکائے ہاتھوں میں ہانسینگ سنک لیے چل رہے تھے ان سے پیچھے ایک فرنچ جوڑا تھا اور ایک جرمن لڑکی۔ یہ ساری ٹیم کیپڈو کیا کی وادیاں چھاننے نکلی تھی۔ کیونکہ سب ایک ہاٹل میں ٹھہرے تھے اور کیپڈو کیا کی وادیاں دیکھنے کے خواہاں تھے۔ مینیجر نے ان کو اکٹھے اس ایک روزہ ٹرپ پر جانے کا مشورہ دیا تھا۔

آغاز انہوں نے کبوتر وادی (Pigeon Valley) سے کیا وہاں وہ نیچے نہیں اترے تھے کسی طائر کی طرح ہی اوپر سے پوری وادی کا نظارہ کیا تھا۔ وہ وادی واقعی ایسی تھی جیسے یہاں کبوتروں کے گھر اور خاندان آباد ہوں پھر وادی حُب

(Love Valley) سے گزرتے وہ گلاب وادی (Rose Valley) پہنچے تھے۔

آغاز میں انہیں وہ مشروم نما پہاڑ نظر آئے سفید اور پھر ایک سرخ وادی کی بیکراں وسعتیں تھیں اور خوبصورت ساخت تھی، نقش و نگار تھے۔ ہانگیگ کے دوران سارا کاسانس بری طرح پھول رہا تھا مگر خوشی تھی جو دل تک سرایت کرتی جاتی تھی۔ وہاں پتھروں کے اتنے رنگ تھے کہ اس کا دل چاہا وہیں سنیاس لے لے اور ان کے سفوف سے تا عمر منظر پیٹ کیا کرے۔ راستے میں ایک تنگ سرنگ میں داخل ہوتے ہوئے وہ کچھ گھبرائی تھی جہاں سورج کی روشنی نہیں پہنچتی تھی مگر جب دوسری طرف سے باہر نکلی تو ایسی انہونی خوشی کا احساس تھا جو شاید صرف اس سرنگ سے ہی مشروط تھی۔

پھر وہ ایک عجیب طرز کا پہاڑ ان کے راستے میں حائل ہوا تھا، دیوار کی طرح اس کی بلندی سیدھی اوپر اٹھتی تھی جہاں جمال نے چڑھنے کی کوشش کی تھی اور اگلے پل دھڑام کی آواز آئی تھی۔ یونہی ان سرخ بیسیکراں وسعتوں میں پھرتے انہوں نے شام کر دی تھی۔ تھکن سے ساری ٹیم کا حشر ہو رہا تھا سو ایک قدرتی غار نما جگہ پر جس کا دہانہ بھی کھلا تھا اور اندر بھی خاصی وسعت تھی انہوں نے رات گزارنے کا فیصلہ کیا۔ وہیں کوئلے سلگائے گئے اور سب اپنا سامان رکھے ٹانگیں پھیلائے، دیواروں سے ٹیک لگائے محو استراحت ہو گئے۔

سارہ اور جمال کو نلوں پر پاکستانی چائے بناتے تھے جس کی فرمائش اس فریج جوڑے نے ان سے کی تھی۔

”اور میرے قدم آج وادی عشق میں تھے۔۔۔ وادی محبت میں۔۔۔“

میں نے گلاب وادی کو سر کیا ہے۔۔۔“ سارا اس قدیم غار کی سانس اپنے اندر اتارتی سوچ رہی تھی جس کی مہک چائے کی پتی کی مہک کے ساتھ مل کر ان سب کو مدہوش کر رہی تھی۔
چائے کے بعد سلپینگ بیگز بھی کھل گئے تھے رات کا کھانا کینڈ فوڈ (ڈبے کی خوراک) تھا جسے بس کھولنا تھا اور کھانا تھا۔

کچھ دیر گزری تھی کہ وہاں کی ساری فضا میں گہما گہمی پھیل گئی، سامنے ایک گروپ نے کیمپنگ کی تھی۔ اس وقت وہ بون فائر کے گرد محور قص تھے جیسے وہ بھی فلنٹ سٹون کا گھرانہ ہوں اور وقت کا پردہ پھاڑ کر یہاں آنکے ہوں، گٹار کی آواز یہاں تک پہنچ رہی تھی۔

”چلو کوئی گیم کھیلتے ہیں۔“ یہ چاکلیٹ رنگ کے بالوں والی ہیلن تھی جرمنی سے اور اس وقت ٹھنڈ سے ہولے ہولے کانپتے اپنے ہاتھوں کو چائے کے مگ سے حدت فراہم کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”گیم کیا ہوگی؟ ہم تو ساتھ کچھ ایسا لیکر نہیں چلے۔“ ایڈم نے بیوی کے کندھے پر چڑھتا ایک ننھا کیڑا انگلی سے نشانہ لیکر اڑاتے ہوئے کہا تھا۔ فرنج جوڑے کے سنہرے بال اور چہرے پاس جلتی آگ میں مزید سنہرے لگتے تھے۔

”سب اپنی زندگی کی ایک سب سے بڑی خواہش بتائیں گے۔“ اس کی بیوی ایلنور نے فیصلہ کیا۔
”سارہ یو فرسٹ۔“ ایڈم نے گیم کا فیصلہ ہوتے ہی کہا تھا۔

”اس سے ہمیں ایک دوسرے کو جاننے کا موقع ملے گا۔“ ایلنور خود کو خود ہی سراہتے ہوئے بولی۔

”مونٹ بلانک (Mont Blanc) کے بیس کیمپ پہ مونٹ بلانک سے ایک ہجر کا نغمہ لکھوں۔“ سارہ نے آنکھیں بند کیے کیے ہی بولا تھا وہ اس وقت آرام کرنے کے موڈ میں تھی اور غار کی سبز

دیار سے ٹیک لگائے کچھ سوچتی تھی۔

”ہجر کا کیوں؟“ ہیلن کو اعتراض ہوا تھا۔

”کیونکہ ہجر ہے اس لیے۔“

”اتنی مہنگی خواہش۔“ ایڈم نے دانت نکالے۔

”مونٹ بلائک کے قلم میرے پاس بہت سارے ہیں بس اب مونٹ بلائک کی طرف سفر کرنا

باقی ہے۔“

”میں دعا کرتا ہوں تمہاری یہ خواہش جلد پوری ہو۔۔۔ ہیلن اب تم۔۔۔“ ایڈم نے لیڈ سنبھالی

ہوئی تھی۔

”میں چاند کے ساتھ سیلفی لینا چاہتی ہوں۔“

”مگر تم نے آج میرے ساتھ کئی بار سیلفی لی ہے۔“ ایڈم نے چہرے پر حیرانی طاری کرتے

ہوئے کہا تھا۔

”میں خلا میں چاند کے ساتھ سیلفی لینا چاہتی ہوں۔“ ہیلن کے چہرے پر مسکراہٹ پھوٹ پڑی

تھی۔

”ہمم۔۔۔ چلو۔۔۔ مشکل ہے۔۔۔ اگر ایلی نے اجازت دی تو میں خلا میں تمہارے ساتھ

چلوں گا۔“ سب کے چہرے پر مسکراہٹ رینگ گئی تھی۔

”لیکن یہ تو میری خواہش سے کہیں زیادہ مہنگی خواہش ہے۔“ سارہ کو بھی اعتراض ہوا تھا۔

”میری یہ خواہش تمہاری خواہش کی طرح جلد پوری ہونے والی ہے کیونکہ میں ایسٹرائٹ بننے

کے پروسس میں ہوں۔ جلد میں سپیس واک کی ٹریننگ بھی لوں گی۔“ اس کی آنکھوں میں خواب کی

قدیلیں جل اٹھی تھیں۔

”اٲلئ اب تمہارئ بارئ۔“

”مئ لاہور دئکھنا چاہئ ہوں۔“

”تواب یہاں سہ ہمارہ سائھ چلئں ٲھر۔۔۔“ جمال جرائں اتار کر غار کئ زمین کئ ٹھنڈک کو

ٲاؤں سہ اٲنہ اندر اتار تہ ہوئہ بولا۔

”ڈن۔“ اٲلئ اس کئ دعوت ٲر خوش ہو گئئ تھئ۔

”اب جمال کئ بارئ تھئ۔“

”مئرئ خواہش ہہ کہ قدرت کہ قانون بدل جائئں۔“

”مثال کہ طور ٲر۔۔۔“ سارا نے کارنز کا کئن خالئ کرتہ ہوئہ اس سہ ٲوچھا۔

”جئسہ وہ ائک نئلا خوبصورت کئڑا جئول وئسٲ

(Jewl Wasp) جو ائک کا کروچ کہ اعصاب مئ اٲنا زہر ڈال کر اسہ ادھ مرا کر دئئ ہہ

ٲھر اس کہ جسم ٲر اندر دئئ ہہ۔۔۔ اندوں سہ نکلا لاروا اس کئ کھال سہ اندر چلا جاتا ہہ اور اس کہ

اعضا ٲر ٲلتا ہہ اور بالغ بن کر باہر نکلتا ہہ، جئسہ کوئل جو دوسرہ ٲرندوں کہ گھونسلوں مئ اندر دئئ

دئئ ہہ اور جئسہ شیر کو زندہ رہنے کہ لئہ کسی ہرن کا شکار کرنا ہہ، عقاب بھوک مئ اٲنا سب سہ کمزور

بچہ کھا جاتا ہہ۔۔۔ جئسہ کوئئ ٲئرا سانگ ٲودا دوسرہ ٲودہ کو ٲورہ کا ٲورا نگل جاتا ہہ۔۔۔ یہ

قانون۔“ وہ چٲ ہو گیا تھا۔ سارا ٲلکئں جھٲکائہ بنا جمال کا چہرہ دئکھ رہئ تھئ۔۔۔

”یہ کئا کہہ رہا ہہ یہ یوں کئوں کہہ رہا ہہ۔۔۔ کئا اس کو اس بات کئ تکلف مئسر ہہ۔۔۔“

”یہ تو تم جنت لہ جانہ کئ باتئں کرتہ ہو۔۔۔“ سارا نے غار مئ ٲھلئ خاموشئ کو توڑا

تھا۔ جوا بجا جمال نے مسکرانہ کئ کوشش کئ۔

”اور اب تمہارئ کئا خواہش ہہ؟“ یہ ائڈم تھا۔

”میری خواہش ہے کہ ہم سب کسی دن ایسی جنت کا نظارہ کریں مل کر۔۔۔ اور جمال کی خواہش پوری ہو جائے۔“ سارا نے ہلکے پھلکے سے انداز میں کہا تھا۔

”اب میری باری۔۔۔“ ایڈم اس سے پہلے کے اپنی خواہش بتاتا سب جان بوجھ کر سونے کے لیے لیٹ گئے۔

”یہ زیادتی ہے۔۔۔“ اس کی آواز غار سے باہر سنائی دی تھی اور سب کی دبی دبی نہی۔



وہ مڑا اور دھیمے سے اسے دیکھ کر مسکرایا۔۔۔ سارہ ہاتھ میں گڑیا لیے کھڑی تھی۔ اس کی دعا کو قبولیت ملی تھی وہ لوٹ آیا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب مسلمانوں اور صلیبیوں میں جنگ ابھی جاری تھیا گرچہ خلافت عثمانیہ قائم ہو چکی تھی۔

”آگئے۔۔۔“

”نہیں۔۔۔ ابھی کچھ دن روپوش ہونا ہو گا وہ مجھے پہچان گئے ہیں۔“ اس نے اس بات سے انجان کے کچھ دور وہ ایک تیر کے نشانے پر ہے گر جاگھر کے بند دروازے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

وہ دھیرے دھیرے ان زرد پتوں کو کچلتے آگے بڑھتی آئی تھی اس سے آگے جمال تھا جس کے بیک پیک کی سائیڈ سے پانی کی بوتل جھانکتی تھی۔

دور کسی نے اس کے سینے کا نشانہ نہ لیا تھا۔

”اور کیسے گزارے دن؟“

”یہ دیکھو اس نے زمین سے اٹھا کر ایک چھابا سا آگے کیا جس میں کپڑے کی ڈھیر ساری گڑیا تھیں۔“

”مانگ بڑھ گئی ہے۔“

سارہ نے دھیرے سے ان پتھروں کی گول سلوں کو چھو آنکھیں نم ہوئی تھیں کیوں؟
دروازے پر بنے سوراخ سے جمال اندر جھانک رہا تھا وہ ہٹا تو اس نے وہاں چشم تر سے
جھانکا۔ اندر ویرانی پھیلی تھی بس دوستوں نظر آرہے تھے۔

اس نے اندر دیکھا وہاں وہ اندر سامنے سسک رہی تھی۔ کسی کا سر اس کے گود میں تھا۔۔۔ وہ خون
آلود جسم وہ اندر گھسیٹ کر لے گئی تھی۔ سارہ نے یکدم ڈر کر سر ہٹایا۔

”کیا ہوا؟“ سارا جو پیچھے کھڑی تھی اس سے پوچھ رہی تھی۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ اتنے میں
وہاں سامنے ایک کیپڈو کین عورت روایتی لباس میں آکھڑی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں چھابا سا تھا وہ
گڑیا بیچ رہی تھی۔

اس سے انہوں نے گر جاگھر کے بارے میں پوچھا وہ ان کی زبان نہیں جانتی تھی پھر اشاروں کی
زبان میں گر جاگھر کی تاریخ بتانے لگی۔ یہ آٹھ سو سال پرانا گر جاگھر تھا اس نے بتایا تھا۔

وہ دھیرے دھیرے چلتے آگے بڑھ آئے تھے۔ اگلی منزل ڈرینکیو (Derinkuyu) غاروں کا
شہر تھا۔

درویس بے کیفے اور چھوٹی سی دکان کے پاس سے گزر کر وہ ٹکٹ کے لیے قطار میں آکھڑے
ہوئے۔ غاروں کا یہ شہر زیر زمین تھا اور کئی منزلہ تھا ساٹھ میٹر زمین کی گہرائی تک۔

”یہاں پر ۲۰۰۰۰ لوگ خواراک اور دوسری ضروریات زندگی کی اشیاء کے ساتھ آرام سے پناہ
لے سکتے ہیں۔“ گائیڈ ان کو اس عجب سی خلقت میں داخلے کے بعد ضروری معلومات فراہم کر رہا تھا۔

”یہ زیر زمین سب سے بڑا یا سب سے پرانا شہر تو نہیں مگر اس شہر کی زیر زمین گہرائی سب سے
زیادہ ہے۔ ڈرینکیو کا مطلب گہرا کنواں ہے۔ اس طرح کے مزید زیر زمین شہر کیپڈو کیا میں موجود ہیں
جن میں سے کچھ ابھی دریافت ہونا اور کھلنا باقی ہیں۔ اس شہر کا باہری دروازہ وہی تھا جس کو کھولنے اور

بند کرنے والی سلیں اس دور میں اس آٹھ سو سالہ پرانے گرجا گھر کی دیوار میں نصب کی گئی تھیں۔ اندر بھی پتھر کے وزنی دروازے تھے۔ ہر منزل الگ دروازے کے ذریعے مکمل بند کی جاسکتی ہے۔ “گائیڈ ساتھ ساتھ چلتے معلومات فراہم کرتا جا رہا تھا۔ جمال کو لمبے قد کے باعث قدرے جھک کر چلنا پڑ رہا تھا۔ اندر گائیڈ ز اور لوگوں کی آوازوں کی بھنبھناہٹ تھی۔

” شراب اور تیل بنانے والی پرانی دستی مشینیں، جانور رکھنے والے کمرے اور جیل اور کھانا کھانے کے لیے کمرے اور عبادت کی جگہیں یہ سب یہاں دریافت ہوئی ہیں۔“ سارا نے وہاں کی ہزاروں سال پرانی دیوار کو چھوا اسے لگا کوئی لہر سی دل سے ہو کر گزری ہے۔ اس نے مڑ کر سارہ اور جمال کو دیکھا جو گائیڈ کے ساتھ محو تھے۔ دفعتاً اس کا پاؤں ایک لوہے کی جالی پر آیا تھا اس نے نیچے نگاہ کی نیچے کی منزل اس جالی سے نظر آرہی تھی۔

” وہ لوگ لمبے لمبے عرصے تک نیچے روپوش ہوا کرتے تھے۔“ اس نے واپس توجہ گائیڈ کی طرف کی تھی۔

”یہاں پانی کو ذخیرہ کرنے کا انتظام بھی ظاہر ہے کیا جاتا تھا اور یہ پانی دو شہروں کے لیے کافی ہوتا تھا۔“ اس پل توجہ ایک قدیم گھڑے نے کھینچی تھی۔

”یہ شہر آٹھویں صدی قبل مسیح میں انڈو یورپین نے نرم آتش فشاں پتھروں کو کھود کر بنایا تھا جب عیسائیوں کی حکومت آئی تو انہوں نے اسے وسعت دی۔ مسیحی سپاہی یہاں عرب مسلمانوں سے باز نطینی عرب جنگوں کے دوران بچنے کے لیے چھپتے تھے۔ زیر زمین یہ سارے شہر سرنگوں کے ذریعے آپس میں جڑے ہوئے تھے، مسلمانوں کے بعد یہ منگولوں سے بچنے کے لیے ان کی پناہ گاہ تھی۔ خلافت عثمانیہ میں بھی یہ ان کی پناہ گاہ رہی۔“

”یہاں سے سیڑھیاں اس کی تہہ میں نیچے جاتی ہیں۔“ گائیڈ بتا رہا تھا۔ اس نے سیڑھیوں کی

تعداد شاید پانچ ہزار بتائی تھی وہ ٹھیک سے سن نہیں سکی تھی۔ وہ لوگ سیڑھیاں اترنے کے لیے آگے بڑھے تھے کہ یکدم کسی نے اس کا دل مٹھی میں لیا تھا۔ اس پل ہوش کھونے سے پہلے اس نے آخری بار سارہ کو پکارا تھا وہ اس سے آگے کھڑی تھی اس کا کندھا پکڑنے کی کوشش کی مگر وہ ہاتھ نہیں رکھ سکی نیچے بیٹھتی چلی گئی۔ سارہ اور جمال سے پہلے اس سے پیچھے کھڑے لوگ متوجہ ہوئے تھے وہ جب سارہ کو پکڑ رہی تھی اس پل اس کے سامنے آئینے تھے اور وہ سارہ کو نہیں خود کو پکڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”کیا میں پاگل ہو چکی ہوں۔۔۔“ عجیب سی لہریں دل سے، جسم سے گزر رہی تھیں۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

”میں رو کیوں رہی ہوں۔ اتنی گھٹن کیوں ہو رہی ہے۔۔۔ کیا قبر کی گھٹن ایسی ہوگی۔۔۔“ لوگ اس کے گرد آگئے تھے۔

”یا شاید یہ آکسیجن کی کمی ہے۔۔۔ میرا دماغ کام نہیں کر رہا۔“ اس کے حواس ساتھ چھوڑ رہے تھے۔

”گزر جائیں گے جب یہ دن یہ ان کی یاد میں ہوگی۔۔۔“

کسی نے کان میں سرگوشی کی تھی آنکھوں میں ایک کمرے کی کھڑکی روشنیاں چھ رہی تھیں، راول جھیل کئے کنارے کوئی رباب بجا رہا تھا، اس کے ہاتھ میں کچھ کاغذ تھے، اماں اسے کسی بات پر خود سے لپٹا کر پیار کر رہی تھیں، سڑک پر پرانی کتابیوں پر برف پڑ رہی تھی، سمندر کے کنارے ایک ستارا مچھلی پر سے لہریں گزر رہی تھیں۔



اس کی آنکھ اپنے منہ کو تھپتھپاتے ہاتھ کی حدت کی وجہ سے کھلی تھی وہ کہاں تھی وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اسے سارہ اور جمال ہاٹل واپس لے آئے تھے اور پھر وہ نیند کی ٹیبلٹ لیکر سو گئی تھی اور اب آرٹھ

سامنے تھا۔

”تم جانتی ہو اب میں لمبے سفر کے قابل نہیں رہا جانے کون کون سے منتر اور اس نقشے کی ڈائمنشن استعمال کر کے یہاں پہنچا ہوں۔“ آرٹھ اس کے سامنے بیٹھا تھا اور وہ زرد چہرا لیے اسے دیکھتی تھی۔

”تم تو یوں کہہ رہے ہو غار میں آکسیجن کی کمی میں نے کی تھی۔۔۔ تمہیں کیسے پتا چلا میں بیمار ہوں؟“ اس نے اسے گھور کے دیکھا۔

”میرے دوست کس حالت میں ہیں اس کی خبر مجھے ان کے پیغام سے نہیں اپنے دل سے پتا لگتی ہے۔“ وہ چھت کو گھورنے لگی تھی۔

”اب مجھے موت کا غم نہیں ہے۔۔۔ میں زندگی کو محسوس کر چکی ہوں۔۔۔ مجھے سوالوں کے جواب نہیں مل سکے۔۔۔ خلا قائم ہے۔۔۔ مجھے نہیں پتا میرے جسم میں قید جو ہے وہ کیا ہے میں نہیں جانتی کہ جس نے اسے پھونکا ہے وہ کون ہے مگر اس نے مجھے جو زندگی دی ہے میں نے اسے محسوس کر لیا ہے اس کی بنائی ہر ہر شے میں۔“ آرٹھ دھیمے سے مسکرایا تھا وہ کامیاب ہوا تھا اس کی تکلون اگرچہ حل نہیں ہوئی تھی مگر حل تھی۔

”ہم یہاں ایسے ہی ہیں سارا جیسے وہ درخت، یا کوئی بلی یا آسمان پر ستارا یا یہ پانی انسان بھی بس یہی ہے دیکھو یہ اپنے وجود کے خلاف مزاحمت نہیں کرتے۔ یہ اپنے وجود میں رکھے گئے خلا کے خلاف مزاحمت نہیں کرتے۔ اسے پر کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔۔۔“ وہ کچھ بولی نہیں تھی جواب میں۔

”بارہ بج گئے ہیں۔“

”تو؟“

”تو تمہاری سالگرہ ہے۔“

”تو؟“

”چلو سیلیبرٹ کرتے ہیں۔۔۔“ اتنے میں فون بجنے لگا تھا اماں کا فون تھا سا لگرہ کی مبارک کا۔ وہ ان سے کافی دیر بات کرتی رہی ان کو پتا نہیں لگنے دیا تھا کہ طبیعت خراب ہو گئی تھی۔

”کیا تحفہ دو گے مجھے؟“

”کیا چاہیے؟“

”خوشبو۔“

آرٹھ نے ہاتھ آگے بڑھایا تھا اس نے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھاما تھا۔

پھر اس نے خوشبو کو پانیوں پر تیرتے دیکھا سفیدی مائل سیاہ خوشبو۔۔۔ عنبریں۔

”یہ عنبر کی خوشبو جانتی ہو کیسے وجود میں آتی ہے۔۔۔“

”کیسے؟“

”ایک خاص وہیل جب کٹل فٹ کھالیتی ہے یا اس قسم کی کوئی چیز جس کا ہاضمہ مشکل ہو تو اس کے صفرے سے آتوں میں عنبر خارج ہوتا ہے اور یہ عنبر وہیل کا ویسٹ ہے جو پانی پر عرصہ عرصہ تیرتا ہے اور کسی خوش نصیب کے ہاتھ ہی لگتا ہے۔ بعض اوقات مردہ وہیل کے پیٹ سے بھی نکالا جاتا ہے۔ جنوبی افریقہ، برازیل، مڈگاسکر ایسٹ انڈیز، مالدیو، چین، جاپان، بھارت، آسٹریلیا، نیوزیلینڈ مولو کا جزیرے میں یہ خوشبو حاصل کی جاتی ہے۔“

اس نے تحفے میں اسے ایک لاکھ پچھتر سال پرانا عنبر کا فاسل دیا تھا۔ وہ اس کے ہاتھوں میں آتے

ہی موم ہوا تھا۔ اس میں عجب حلاوت زدہ زمینی، سمندری اور حیوانیت کی حرارت لیے خوشبو تھی۔

”اسے عام مت سمجھنا اس سے بڑے بڑے لوگ امیر ہو جاتے تھے بہت مہنگا ہوتا ہے یہ۔“

”اور مزید۔“ سارہ نے منہ بنایا۔

”چارلس دوئم انڈوں کے ساتھ اسے ناشتے میں لیتا تھا۔“

”اور۔۔۔“ سارا کی ہنسی چھوٹی تھی۔

”ابن بطوطہ نے جب سفر میں ملے تحفوں کا ذکر کیا اس میں قیمتی پتھروں کے ہمراہ خاص عنبر کا

ذکر بھی تھا۔“

پھر اس نے ہمالیہ کے پہاڑوں میں ہرن بھاگتے دیکھے پھر ان کا شکار ہوتے اور ان میں سے مشک

نکالتے دیکھا۔۔۔

ہند میں مشک کستوری کہلاتی ہے آرٹھ نے اس کے ہاتھ میں مشک رکھتے ہوئے کہا۔ وہ گہرے

جامنی رنگ میں تھی۔ اس کی یہاں پہلی بار دریافت کے بعد یہ عرب اور بازنطینی ریاست میں خوشبو اور

ادویات میں استعمال ہونا شروع ہوئی۔

”ادویات؟“

”ہاں اس سے بہت سی نفسیاتی، اعصابی اور دل کی بیماریوں کا علاج کیا جاتا ہے۔“

پھر وہ جنگلوں میں تھی صندل کے جنگل اور دیودار کے اور عود کے۔ اس نے عود کی خوشبو کو اپنے

سامنے درخت کے تنے پر نکلتے اور بنتے دیکھا۔ جب فنگس یا بیسکٹریا اس درخت کی لکڑی پر حملہ کرتے ہیں

تو تنا ایک مواد خارج کرتا ہے جو اس حملے کی مزاحمت میں ہوتا ہے شفا یابی کے لیے گہرا، تیز، حلاوت زدہ

مگر تلخی لیے۔

وہ وہاں پرواز میں تھی۔۔۔ خوشبویں روح کو معطر کرتی تھیں جسم کے خلیوں میں تازگی بھرتی

تھیں۔ پھولوں کی خوشبوئیں اور ہریاؤں کی اور زرد گھاس کی۔۔۔ پھر اس نے ڈوبتے سورج کی خوشبو

محسوس کی، مٹی کی اور پانی کی، ستاروں کے غبار کی خوشبو اور سیاہ خلا کی۔۔۔ کائنات کی خوشبو چہار

سو۔۔۔ یہ ازل کی خوشبو سدا بہار۔۔۔ یہ خوشبو اس سمفنی کی جس میں ساری کائنات محورِ قص ہے یہ

لامحدودیت کی خوشبو۔۔۔ لامحدود کناروں تک پھیلی۔۔۔ انفینیتی۔۔۔ سازوں کی خوشبو۔

آرٹھ نے اسے اس کی زندگی کا سب سے بڑا تحفہ دیا تھا۔۔۔ وہ ہاتھوں میں مومی عنبر دبائے خانہ کعبہ میں تھی۔

وہ کن فیکن کے لمحے تھے۔۔۔ وہ جانے کتنی دیر طواف کرتی رہی، کن کن زمانوں میں طواف کرتی رہی تب جب کعبہ کا غلاف سفید تھا اور تب جب سبز تھا جس میں سونے اور چاندی کے دھاگوں سے کشیدہ کاری کی گئی تھی اور اب جب سیاہ ہے۔ وہ لامکاں تو عرصے سے تھی اب لازماں بھی ہو چکی تھی۔ وہ گھٹنوں پر سر رکھ کر روتی تھی۔

ایک اچھی زندگی اس کی منتظر تھی چاہے وہ جتنی تھی۔۔۔ جیسی تھی۔ چند لمحوں میں زندگی جی جاسکتی ہے چند لمحوں میں لامحدود زندگی جی جاسکتی ہے۔۔۔ اور بعض اوقات لمبی زندگی گزار کر انسان بغیر جیے چلا جاتا ہے۔ وہ آرٹھ کے ساتھ واپس لوٹ رہی تھی وہاں سے اس دنیا میں جہاں ممتا تھی، دوستی تھی، محبت تھی، رنگ، ساز اور خوشبو تھے۔ کیا ضروری ہے ہر سوال کا جواب ہو۔۔۔؟



ختم شد

اس ناول پر آپ کی قیمتی رائے کا انتظار رہے گا۔